ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

نومبر

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	بقائے انفع کا بے لاگ قانون	سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر	۳
۳۔	گوشۂ سیرت	اسلام-مشاہیر عالم کی نظر میں (قسط-۱۰)	تحریر: مسٹر اڈیار، مترجم: ایم، اے، جمیل احمد	۸
۴۔	بحث و تحقیق	شہریت کا مسئلہ (آخری قسط)	محمد قمر الزماں ندوی	۱۰
۵۔	// //	مستشرقین اور حدیث	محمد فرید حبیب ندوی	۱۷
۶۔	تربیت اولاد	بچہ کے غصہ کے ساتھ کیسے برتاؤ کریں (قسط-۲)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۲۴
۷۔	دردِ دل	ہماری اخلاقی پستی، مظلومیت اور ذلت کا.....	یحییٰ نعمانی	۳۲
۸۔	نقطۂ نظر	مسلم نوجوانوں کی بیداری کی ضرورت.....	مجیب الرحمٰن عتیق ندوی	۴۱
۹۔	توجہ طلب مسئلہ	کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا	محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۴۷
۱۰۔	سفرنامہ	تاریخی شہر استنبول میں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۵۴
۱۱۔	تعارف و تبصرہ	شیخ مبارک بود لے جائسی اور.....	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۱
۱۲۔	// //	مفکر اسلام-ایک مطالعہ	شاکر فرخ ندوی	۶۳
۱۳۔	آخری صفحہ	قبول کرلیں تو سمجھیں کہ ہم بھی مخلص ہیں	م۔ق۔ن۔	۶۴
۱۴	شعر و ادب	غزل	اکبر الہ آبادی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

بانی ادارہ کی علالت:

گزشتہ دنوں بڑی مصروفیت اور ذہنی الجھنیں رہیں، اسی درمیان ایک پریشانی یہ آ گئی کہ اچانک علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے ناظم اور اس سے ملحق اداروں کے بانی ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی صاحب سخت علیل ہوگئے، ڈاکٹروں نے دماغ کے خطرناک آپریشن کا مشورہ دیا، اس سرجری کی خطرناکی نے متعلقین کے ہوش اڑا دیے لیکن سچ یہ ہے کہ دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے، اور نیکیوں کا ثمرہ انسان ایسے ہی موقع پر پاتا ہے، لوگوں نے بڑے پریشان کن واقعات سنائے، لیکن ڈاکٹر صاحب قبلہ کا الحمدللہ بڑا کامیاب آپریشن ہوا، ڈاکٹروں کے مطابق الحمدللہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا، اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد مکمل صحت یاب کرے، امید ہے کہ قارئین دل کی گہرائیوں سے ان کی صحتیابی کے لئے دعاؤں کا اہتمام کریں گے، ان کی ذات سے ملت کے کئی منافع متعلق ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت و درازی عمر عطا فرمائے اور ان کے ذریعہ ملت کو نفع پہنچانے کا سلسلہ جاری وساری رکھے۔

یہ دنیا انسانوں سے بھری ہوئی ہے، لیکن ان انسانوں میں بعض قیمتی ہیرے ہیں، ان ہی ہیروں میں ایک کوہ نور وہ ہے جس کو لوگ ڈاکٹر غیاث صدیقی کے نام سے پہچانتے ہیں، کم از کم میں نے جب سے ڈاکٹر صاحب قبلہ کو دیکھا دوسروں کے لیے ہی جیتے ہوئے دیکھا، اپنے لیے تو سب جیتے ہیں، اس دور مادیت میں ایسی بے نفسی بس ان ہی کا حصہ ہے، وہ بڑے باہمت، بلند اخلاق اور بے نظیر اخلاص کے حامل بلکہ حسن اخلاق اور اخلاص ومحبت کا پیکر ہیں، سخاوت و فیاضی ان کی شخصیت کا جزء ہے، اخلاق واخلاص کے مجسمے اس دور میں نایاب بھی ہیں اور کمیاب بھی، بڑے تو بڑے چھوٹوں کی جس طرح وہ رعایت کرتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ان کی قدر کرتے ہیں وہ قابل تقلید ہے، ہر کسی کو راضی رکھنے کا سلیقہ کوئی ان سے سیکھے، ہر کس وناکس کی رعایت، سب کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ، دن رات کام کی لگن، ملت کے نونہالوں کے مستقبل کے تئیں تڑپ ان کو قدرت نے ودیعت کی ہے، ان کی طرح بزرگوں سے عقیدت، اہل علم کی قدر، ہر شخص کا احترام، اخلاص ومحبت، نرم خوئی ونرم دلی، رعایت ومروت، ان کے متعلقین ورفقاء کار میں کیا دور دور تک نظر نہیں آتی، ان کی رعایت ومروت ہی ہے کہ بعض بے حس یہ سمجھ کر کہ ان کو تو احساس ہی نہیں ہوتا پہ در پہ نقصان پہنچایا کرتے ہیں، اور موصوف محترم انسانیت کی رعایت میں ہر لمحہ گھٹ گھٹ کر خون کے گھونٹ پیا کرتے ہیں، کمالِ بردباری یہ

ہے کہ ایسے بے حس اور کم ظرف لوگوں کو ڈاکٹر صاحب یہ بھی احساس نہیں ہونے دیتے کہ گویا وہ ان کے کرتوتوں سے واقف ہیں چہ جائیکہ یہ باور کرائیں کہ ان کو ایسے لوگوں کی حرکتوں سے کس قدر تکلیف ہے، ان کی رعایت وشرافت کی انتہا ہے کہ وہ ایسے بہت سے لوگوں سے بے حد ادب واحترام اور خلوص ومحبت کے ساتھ ملتے ہیں جن کے بارے میں ان کو خوب ادراک ہوتا ہے کہ یہ لوگ محض رسمی طور پر اپنے مفادات کے لیے مل رہے ہیں۔

ان کے اس طرح کے عارضہ میں مبتلا ہونے سے طبیعتوں پر اثر ہونا لازمی اور فطری ہے، کہاں ہیں اس دور میں ایسے لوگ جو انسانوں کی قدر کریں، انسانیت کا احترام کریں، انسانی جذبات واحساسات کا لحاظ کریں، چھوٹوں کو بڑا سمجھیں، بڑوں کو تو سب بڑا سمجھتے ہیں، اصحاب ثروت ومناصب کا تو سب احترام کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب ہمہ وقت ہر کس وناکس کی مدد کو تیار رہتے ہیں، ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے ہیں، وہ خود تو شوگر اور دل کے مریض ہیں لیکن دوسروں کو جس طرح ترجیح دیتے ہیں اور خدمت کرتے ہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ان کی سی عمر اور ان کی طرح کے امراض کے شکار لوگوں میں اس طرح کام کا جذبہ نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا ہے تو وہ مخدوم ہی بننا پسند کرتے ہیں، ان کی طرح خادم قوم بن کر رہنا تو بس ان ہی کا حصہ ہے، کہاں ہیں ایسے لوگ جو اداروں کے بانی ہوں اور خود ہی صبح وشام تک زمینی سطح کے ایک انسان کی طرح مدرسہ کے سارے کام کرتے ہوں، اپنی گاڑھی کمائی کا اچھا خاصہ حصہ مدرسہ پر خرچ کرتے ہوں، ہر قدم پر اولادوں اور عزیزوں سے مدرسہ کا تعاون کراتے ہوں، انہوں نے بڑی حساس طبیعت پائی ہے لیکن دوسروں کی رعایت میں اپنی حساسیت کو خون کا گھونٹ سمجھ کر پینا کوئی ان سے سیکھے، یہ سطریں عجلت و الجھن میں صحیح لیکن ایک عینی شاہد کے قلم سے ہیں، پہلی مرتبہ دیکھا کہ اللہ کے اس بندے کو اپنے شیخ ومرشد سے کس قدر عقیدت ہے، ایسی حالت میں چل کر حاضرِ خدمت اور ملتمسِ دعاء ہوئے جب کوئی ہلنا پسند نہیں کرتا، اپنے تمام بزرگوں سے دعاء کی درخواست کی، سرجری کے لئے جانے سے تھوڑی دیر پہلے تک بھی نہ اولادوں کا فکر دامن گیر رہا اور نہ گھر والوں سے مخاطب رہے، صرف مدرسہ کی دھن تھی، مختلف کاموں کا تذکرہ زبان پر تھا اور اپنے ادھورے کاموں نیز مدرسہ کے عدم استحکام کا فکر تھا جو انہیں پریشان کیے تھا۔

جہد مسلسل اور خلوص ومحبت کے اس پیکر اور حسن اخلاق کے اس مجسمے کو اللہ نے اس خوفناک مرحلہ سے صحیح وسالم گزارا، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے اور صحت وعافیت وعمر دراز عطا کرے، رشتہ داروں کے علاوہ احباب ومتعلقین اور قدر دانوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور زبان حال سے سب لا باس طھور انشاء اللہ ہی کہہ رہے تھے، اس دعاء کا اثر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ہمیں ذات باری کی رحمت بے پایاں سے یقین کامل ہے کہ وہ ان سے ابھی اپنے دین اور ملت اسلامیہ کا مزید کام لے گا اور انہیں نونہالان ملت کے مستقبل کی تعمیر کا ذریعہ بنا کر عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے گا۔

عالم اسلام کی خطرناک صورت حال:

ان دنوں عالم اسلام کی صورت حال اتنی پیچیدہ اور خطرناک ہے کہ ہر آن کسی نئی مصیبت کا دھڑکا لگا رہتا ہے، اغیار کی سازشوں اور شاہان عرب کی اسرائیل نوازی اور دین فروشی، گدی کی حفاظت میں اندھے پن اور ویشترون به ثمنا قلیلا کی روش نے صورت حال کو اس قدر پیچیدہ کر دیا ہے کہ اس کا صحیح اندازہ کرنا بھی ممکن نظر نہیں آتا، ربیع عربی (عرب بہاریہ) کو ناکام بنایا گیا، مصر میں اسلام پسندوں کو زمین دوز اور پس زنداں کیا گیا، شام میں خون کی ہولی جاری ہے، مصر میں صہیونیت پسندوں کو غلبہ ملا، شام میں نصیریت کو تحفظ فراہم کیا جا رہا ہے، یمن میں اہل تشیع کو مسلسل تعاون جاری ہے، سب کے پیچھے کہیں نہ کہیں عالم اسلام کی مرکزیت کا فائدہ اٹھانے والی حکومت اپنا ناپاک کردار ادا کر رہی ہے، حالیہ اطلاعات اس کے لیے بھی خوش کن نہیں ہیں، اور دستور قدرت بھی ہے کہ ظلم ونفاق کی عمر بہت لمبی نہیں ہوتی، ظالموں نے اسرائیل کی حفاظت کے لئے اخوانیوں کی حکومت اکھاڑ پھینکی اور اسی پر بس نہیں ہے بلکہ ان کی مشاورت کے بعد سیسی کی جانب سے ایسے بیانات ہیں کہ فلسطینی غزہ سے دستبردار ہو جائیں اور اس کے بدلہ میں وادی سینا میں جگہ لے۔ لیکن ان کی ناعاقبت اندیشیاں کیا گل کھلائیں گی اس کا صحیح اندازہ نہیں، اتنا ضرور طے ہے کہ موجودہ عالمی سیاست میں ایران کا کردار سب سے نمایاں ہے، اس سے ساز باز اور دوستی جزیرۃ العرب کی کمزوری ثابت ہو رہی ہے، شام ویمن میں اس کا تسلط ہو رہا ہے اور اب ترکی میں بھی دراندازی کے لئے یہ سب منافقین تیار ہیں۔

اس پورے منظر نامہ پر نظر ڈالتے ہوئے ترکی کو دیکھ کر کچھ اطمینان ہوتا تھا، لیکن یہ خطرہ ہر وقت لاحق تھا کہ باہر کے دشمن شاید بعد میں بری نظر ڈالیں لیکن اپنی صفوں کے منافقین کب تک اسے بخشتے رہیں گے، حالیہ خبریں بڑی تشویشناک ہیں، ترکی نے اگرچہ زبردست معاشی ترقی کی ہے، اسلام پسندوں کو وہاں پناہ بھی ملی ہے، اسلامی اقدار کا احیاء بھی ہو رہا ہے اور اردوغان کی گرفت بھی مضبوط ہے، (ہم اپنے کسی مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں) لیکن شاہان عرب کو یہ کب گوارا کہ جس کو وہ درہم ودینار میں تولیں اردوغان اس کے ساتھ دسترخوان پر بھی نہ بیٹھیں، جس کو وہ قانونی صدر تسلیم کریں اسے وہ اقوام متحدہ میں غاصب کے لقب سے یاد کریں، غزہ کی مدد میں سب سے پیش پیش نظر آئیں، اسرائیل کو متنبہ کریں، اخوانیوں کو پناہ دیں اور شام کے سفاک کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کریں، وہاں کے عوام کو اقتدار میں حصہ دلانے کی کوششیں کریں، اقوام متحدہ کے حالیہ اجلاس کے بعد صورت حال مزید خطرناک ہوگئی ہے جبکہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے داعش کے خلاف جنگ میں ترکی کو گھسیٹنے کی کوشش شروع کر دی ہے اور اس کے ایرویز استعمال کرنے کی اجازت مانگنی شروع کر دی ہے، جبکہ داعش کے متعلق کوئی قطعی بات کہنا ہمارے بس کی بات نہیں، اصحاب نظر کا اس سلسلہ میں سخت اختلاف ہے، کوئی مکمل مثبت رویہ اپناتا ہے تو کوئی بالکل منفی جبکہ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ غلطی ان کے فکر میں نہیں بلکہ ان کے طرز عمل میں ہے اگر طرز عمل صحیح ہو تو بات کچھ اور ہو، ایک طرف ان کی تحویل سے آئی ہندوستانی نرسز کے وہ بیانات ہیں جو ان کو

اسلام پسند اور مصلح بتاتے ہیں دوسری طرف میڈیا کی وہ تصویریں ہیں جو انہیں دہشت گرد قرار دیتی ہیں، خود مقامی دانشوروں میں بھی اختلاف رائے کا یہی عالم ہے کوئی انہیں عراق کی شیعہ حکومت کے مظالم کے مقابلہ میں رحمت شمار کرتا ہے تو کوئی انہیں خوارج کے افکار کا حامل بتاتا ہے، بہر حال داعش کے حق و ناحق پر ہونے کا فیصلہ تو وقت کرے گا البتہ سوشل میڈیا کی تفصیلات حقائق تک پہنچنے میں معاون ہوسکتی ہیں، ٹی۔وی اور اخبارات کی خبریں تو سنسر ہوتی ہیں ان کا کیا اعتبار، اس وقت جو تشویش ہے وہ یہ کہ اس غیر واضح جنگ میں ترکی کو شامل کرنے کی ضد کی جارہی ہے، اس سے زیادہ تشویشناک یہ ہے کہ ترکی حکومت کو اندرونی طور پر الجھانے کے لئے ایک بار پھر کردوں اور حکومت کے ٹکراؤ کی سازش رچی جارہی ہے، اردوغان پہلے حکمران ہیں جنہوں نے کردوں سے معاہدے اور مصالحتیں کیں اور کردوں کو قومی ترقی کے دھارے میں شامل کیا ورنہ ان کے پیش رو ہمیشہ ان کو دباتے رہے اور ان سے ٹکراتے رہے، چنانچہ اب داخلی و خارجی بہر دو اعتبار ترقی کی راہ پر گامزن اس اسلام پسند حکومت کو گھیرنے کی تیاری ہے، خدا کرے کہ ترک دانا کی دانائی امریکہ کو اپنے اڈے دینے سے باز رہے اور خود جو بن پڑے وہ کرے، کسی صاحب نظر کا اس صورت حال پر یہ تبصرہ بڑا اچھا تھا کہ ۶۰ کی دہائی تک پاکستان بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کررہا تھا، حتی کہ وہ جرمنی جیسے ممالک کو قرضے دے رہا تھا اور ایک طاقت بن کر ابھر رہا تھا، لیکن پھر اس کو لگام دی گئی اور اس کو ایسے دلدل میں پھنسایا گیا کہ آج تک اس کے لئے اس دلدل سے نکلنا مشکل ہے، اسرائیلی لیڈروں کے مبینہ بیانات موجود ہیں ''کہ ہم پاکستان میں وہ انتشار برپا کریں گے کہ وہ کبھی سنبھل نہ سکے گا'' بھولے بھالے لوگ وہاں رونما ہونے والے واقعات کو بڑی آسانی کے ساتھ شیعیت وسنیت کی جنگ قرار دے کر دامن جھاڑ لیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ دہشت گرد پیدا نہیں ہوتے بلکہ پیدا کیے جاتے ہیں، چنانچہ جس ڈرامہ نے عالمی ظلم و دہشت کے ٹھیکیداروں کو پاکستان میں کامیاب تجربہ سے ہم کنار کیا تقریبا اب وہی ڈرامہ دوبارہ ترکی میں اسٹیج کرنے کی تیاری ہے، فرق اتنا ہے کہ وہاں سازش رچنے والوں میں اسلامی ممالک نہیں تھے، لیکن ترکی کے خلاف سازش رچنے والوں میں صحرائے عرب کے چھوٹے چھوٹے مفاد پرست حکمراں بھی شامل ہیں جن کے بیانات خود شہادت دے رہے ہیں، ایران کے وزیر خارجہ کا یہ بیان اس کے اور اس کے ہمنواؤں کی بلبلاہٹ اور سازش کی خطرناکی کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ ''ترکی خلافت عثمانیہ کا خواب دیکھ رہا ہے جو کہ بہت خطرناک خواب ہے'' اس بیان کو حالیہ واقعات اور تاریخ میں موجود ایران و ترک دشمنی کی روشنی میں دیکھنا چاہیے اور یہ دعا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عالم اسلام میں امن وامان قائم فرمائے اور اسلام کو غلبہ عطا فرمائے، تُرک دانا کو استحکام و استقامت سے سرفراز کرے اور خلافت عثمانیہ کا احیاء نہ صحیح مگر عالم اسلام کو مستحکم فرمائے۔

تصویر وطن:

امریکہ میں ہمارے وزیر اعظم نے مقبوضہ فلسطین کے سربراہ سے ملاقات کی اور متعدد تجارتی اور قیام امن کے معاہدے کیے، اسی دوران وطن عزیز کے سرکاری ٹیلی ویزن پر ملک کی سب سے خطرناک تنظیم کے سربراہ کی تقریر براہ

راست نشر کی گئی، یہ وہ تنظیم ہے جس پر کانگریس کے رہنما دگ وجے سنگھ اور متعدد سیاسی لوگ پابندی لگانے کا بارہا مطالبہ کر چکے ہیں، ادھر سرحد پر کشیدگی بھی شروع ہوگئی اور چھوٹے چھوٹے واقعات بشمول ''لو جہاد'' بھی ظاہر ہونے لگے، مہنگائی پر کیا تبصرہ۔۔۔۔۔ کہ یہ حکومت تو کانگریس کے ذریعہ برپا کی گئی مہنگائی کی مار کو دور کرنے، اس کے کرپشن کو دھلنے اور کالا دھن واپس لانے کے لئے ہی آئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مہنگائی اب شباب پر ہے اور عزت والوں کے لئے مہنگائی کے سبب عزت بچانا مشکل ہو رہا ہے، ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس مرتبہ حکمراں جماعت کو الیکشن جتانے میں اسرائیل کا بڑا کردار رہا ہے، حالیہ واقعات اس پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔

دور درشن پر RSS کے سربراہ کے متنازع بیانات کو براہ راست نشر کرنے کے یہی معنی ہیں کہ ملک پر اس کی حکمرانی ہے اور اس کی حکمرانی کا مطلب اسرائیل کی حکمرانی ہے، جب غزہ میں صف ماتم بچھی تھی تو ہماری حکومت مذمتی قرارداد تک نہ پیش کر سکی، اس پر طرفہ یہ کہ اس کی تجارتی کمپنیوں کو دعوت تجارت دی گئی کہ ہم بھی فلسطینیوں کے قتل میں شریک ہوں، اس سے جنگی ساز و سامان خریدنے کے معاہدے کیے گئے، اس سے قیام امن کے معاہدے ہوئے، جو ملک جنگی جرائم کا مرتکب اور امن و امان کا دشمن ہو اس سے معاہدوں کا مطلب ہے کہ اب وطن عزیز کا خدا حافظ۔۔۔ اور کم از کم مسلمانوں کا تو خدا حافظ، ہندوستان میں اسرائیل کا بڑھتا اثر و رسوخ اور موجودہ حکومت سے اس کے گہرے ہوتے رشتے وطن عزیز کے حق میں فال نیک نہیں اور کم از کم مسلمانوں کے لئے تو یہ معاملہ انتہائی تشویشناک ہے۔

موجودہ حکومت کی پالیسیاں وقت کے ساتھ اپنی زہرناکی ظاہر کر رہی ہیں، مسلم دانشوروں اور سیاست دانوں سے کیا عرض کی جائے کہ دیوانوں کی بڑ کا ان پر اثر کیا ہوگا، لیکن پھر بھی ابھی سنبھلنے کا وقت ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا سکون غارت ہونے سے پہلے صورت حال کا صحیح اور جرأت مندانہ جائزہ لیا جائے اور وقت سے پہلے طویل المیعاد اور متحدہ منصوبے تیار کر لیے جائیں، ورنہ موجودہ حکومت جس روش پر چل رہی ہے اس سے صاف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہماری غفلت، انانیت اور انتشار کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں ہوگا، ویسے بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی تمام تر بے بسی و بے چارگی اور پسماندگی کے باوجود ان کی آزادی، ان کا مذہبی رنگ اور ان کا سکون پھوٹی آنکھ بھی نہیں بھاتا۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

☆☆☆

گوشۂ سیرت (قسط-۱۰)

''اسلام- جس سے مجھے عشق ہے''

اسلام-مشاہیرِ عالم کی نظر میں

تحریر: مسٹر اڈیار ترجمہ: ایم اے جمیل احمد

ہمارے یہاں کے دانشور انا دورائی نے نبی کریمؐ کو جس احترام کی نگاہ سے دیکھا اس کا ہم ذکر چکے ہیں۔ صرف انا دورائی ہی نہیں دنیا کے مختلف ممالک کے دانشور اور مدبر سبھی نے نبی عربی کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ نپولین سے لیکر انسائیکلو پیڈیا آف برٹانکا کے مدیروں تک سبھی نے آنحضورؐ کی خدمت میں ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔

نپولین نے کہا تھا: ''وہ دن دور نہیں کہ سارے ہی ممالک کے مدبرین مل کر قرآن کے اصولوں کے مطابق ایک ہی طرز کی حکمرانی کو اختیار کریں گے۔ قرآن کی تعلیمات اور اس کے اصول سچائی پر مبنی ہیں اور نوعِ انسانی کو خوشیوں اور خوشحالیوں سے مالا مال کرنے والے ہیں۔ لہذا خدا کے بھیجے ہوئے رسول محمد ﷺ اور آپؐ پر نازل کی ہوئی کتاب قرآن پر میں فخر کرتا ہوں اور آپؐ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں''۔

گاندھی جی نے کہا: ''قرآن کا متعدد بار میں نے غور سے مطالعہ کیا۔ سچائی اور رہنمائی کی تعلیم اس میں دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی''۔

ڈاکٹر سیمول جانسن اپنی شہرۂ آفاق کتاب اورنٹیل رلیجنس میں رقمطراز ہیں: ''قرآن نہ نثر ہے نہ نظم، تاہم وہ اپنے اندر نثر کا زور بھی رکھتا ہے اور نظم کا حسن بھی۔ وہ نہ تاریخ ہے نہ کسی کی سیرت کی کتاب، تاہم موعظت و عبرت دلانے میں ان سب سے زیادہ مؤثر ہے۔

حضرت موسیٰ کو تورات بیک وقت عطا ہوئی تھی، لیکن قرآن بیک وقت نازل نہیں ہوا اور نہ بیک وقت پیش کیا گیا، پلاٹو کی کتاب میں تحقیق و رسرچ کا انداز اختیار کیا گیا ہے، لیکن قرآن کا انداز و اسلوب خود اس کا اپنا ہے۔ وہ ایک داعی کی آواز ہے حکمتوں سے لبریز، جدوجہد کا جذبہ اور عمل کا جوش بھر دینے والی کتاب۔ اپنی دعوت کے مخالفین کو چیلنج کرنے والی کتاب، سوز و درد کے ساتھ انہیں

سمجھانے والی کتاب، وہ اتنی پر حکمت اور جامع کتاب ہے، کہ ہر ملک اور ہر زمانے کے لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر، چاہے یا بغیر چاہے اس کی تعلیمات کے زیر اثر اپنے کو رکھنے پر مجبور پاتے ہیں۔ اس کی صدائے بازگشت ایوانوں میں سنی جارہی ہے اور صحراؤں میں بھی، شہروں میں سنی جارہی ہے اور دیہاتوں میں بھی۔ بلا کسی تفریق کے ہر کسی پر اس کی چھاپ پڑ رہی ہے۔

سب سے پہلے اس کتاب نے اپنی دعوت پر لبیک کہنے والوں السابقون الاولون کے دلوں کو گرمایا پھر ان کو ایک اجتماعی تحریک میں ڈھالا، یہ تحریک طوفان کی طرح اٹھی۔ ایران و ایشیا کے مختلف ممالک سے گذرتے ہوئے دور تک جا پہنچی۔ وہاں جو بھی تعمیری افکار تھے ان کو اس تحریک نے اپنے اندر جذب کیا اور ظلمتوں میں بھٹکنے والے عیسائی یورپ کو حکمت و دانش کا درس دیا۔''

قرآن شریف کے پہلے انگریزی مترجم مسٹر راڈویل اپنے مقدمہ میں یوں قرآن کے ثناخواں ہیں:

''عرب کی جاہل، انگھڑ اور تہذیب سے نا آشنا قوم کو ایک مختصر سی مدت میں دنیا کی امامت اور حکمرانی کے قابل صرف اس کتاب نے بنایا۔ گویا کسی نے جادو کی چھڑی گھمادی اور ایک عظیم انقلاب عربوں میں آناً فاناً آ گیا۔''

یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو مسز سروجنی ناڈو نے مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ میں اپنا خراجِ عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا:

''قرآن حکیم ادب و انصاف کا منشور ہے۔ آزادی کا چارٹر ہے۔ عملی زندگی میں حق و انصاف کی تعلیم دینے والی قانون کی عظیم کتاب ہے۔ کوئی دوسری مذہبی کتاب قرآن کی طرح زندگی کے سارے ہی مسائل کی عملی تشریح اور حل پیش نہیں کرتی۔''

جرمنی کے دانشور گوئٹے نے کہا:

''جب بھی میں قرآن کو دیکھتا ہوں نئے نئے معنی وہ کھولتا چلا جاتا ہے۔ اس کتاب کی کشش اپنے پڑھنے والے کو آہستہ آہستہ کھینچتی ہے اور بالآخر اس کے ذہن و دماغ پر چھا جاتی ہے۔''

مشہور مؤرخ گبن نے ان الفاظ میں ہدیۂ تبریک پیش کیا ہے:

''نظریۂ توحید کو واضح الفاظ میں بیان کرنے والی اور دلوں میں توحید کا نقش بٹھانے والی عظیم کتاب قرآنِ کریم ہے۔''

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مرتب لکھتے ہیں:

''دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور حفظ کی جانے والی کتاب قرآن ہے۔ یہ امتیاز دنیا کی کسی بھی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔''

☆☆☆

بحث وتحقیق (قسط-۲)

شہریت کا مسئلہ

محمد قمر الزماں ندوی
استاذ مدرسہ نور الاسلام کنڈہ، پرتاپگڑھ

شہریت کے حقوق کیا ہیں؟

اس سوال کا جواب اور حل پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میثاق مدینہ کے حوالے سے چند تمہیدی باتیں سامنے آجائیں۔

اسلامی مملکت کے قیام کے بعد آپؐ نے میثاق مدینہ کا اہتمام کیا، اور مہاجرین، انصار، یہود وعیسائی اور دیگر قبائل کو جمع کیا اور اس موقع پر ایک تحریر لکھوائی۔ جس کو ہم پہلا تحریری دستور قرار دے سکتے ہیں جس میں امن و مان کی ضمانت، اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری، فکری و مذہبی آزادی کا پورا خیال رکھا گیا جس کے بنیادی اجزاء ونکات کو ملاحظہ کیجئے؟

(۱) آبادیوں میں امن رہے گا تاکہ سکون سے نئی نسل کی تربیت کی جاسکے۔

(۲) مذہب اور معاش کی آزادی ہوگی۔

(۳) فتنہ وفساد کو قوت سے ختم کیا جائے گا۔

(۴) بیرونی حملوں کا مل کر مقابلہ کیا جائے گا۔

(۵) حضورؐ کی اجازت کے بغیر کوئی جنگ کے لئے نہیں نکلے گا۔

(۶) میثاق کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا تو رسولؐ سے رجوع کیا جائے گا۔

اس معاہدے میں مسلمانوں، یہودیوں اور مختلف قبیلوں کے لئے الگ الگ دفعات مرقوم ہیں، یہ اصل میں مدینہ کی شہری مملکت کے نظم ونسق کا ابتدائی ڈھانچہ تھا،

یہاں یہ بات واضح طور پر ذہن میں رہے کہ حضورﷺ یونان کی شہری ریاستوں کی طرح محدود ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ آپؐ نے ایک عالمگیر مملکت کی بنیاد ڈالی تھی جو مدینہ کی چند گلیوں سے شروع ہوئی اور روزانہ ۹۰۰ کلومیٹر کی رفتار سے پھیلتی رہی، اس وقت دس لاکھ مربع میل کی مملکت تھی جب اللہ کے رسولﷺ نے دنیا سے پردہ فرمایا۔ (مستفاد از محمد رسولﷺ مؤلف ڈاکٹر حمید اللہ)

اس میثاق یعنی صحیفہ میں بلدیاتی نظام کے تعلق سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) امن ومان کا قیام

(۲) تعلیم وتربیت کی سہولتیں

(۳) روزگار، سکونت اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی۔

اوپر کی تفصیلات کا گہرائی سے اگر مطالعہ کیا جائے تو اسلامی نقطۂ نظر سے وہ سارے حقوق جن کا سوال نمبر۴ میں ذکر آیا ہے شہریت کے حقوق مانے جائیں گے۔ مثلا ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ و دو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر پیشگی اجازت کے بغیر آمد ورفت کا حق۔

نوٹ: اگر اس ملک میں کسی خاص ریاست یا صوبہ (میں) کے لئے حکومت نے کسی خاص مصلحت سے دوسرے صوبے کے لوگوں کے لئے زمین کی خریداری پر روک لگادی ہو تو اس ملک کا نیا بننے والا شہری بھی اس آڈر اور حکم کا مکلّف ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

شریعت میں پناہ گزینوں کے حقوق

شریعت اسلامی کی رو سے اگر کسی ملک میں وہاں کی حکومت کی اجازت سے لوگ پناہ لیتے ہیں جن کو عرفِ عام میں آج پناہ گزیں کہا جاتا ہے تو ایسے لوگوں کو اس ملک میں زندگی گزارنے نیز اولاد کی تعلیم و تربیت اور حفظان صحت کے سلسلے میں تمام رعایتیں دی جائیں گی اور اگر حکومت ان لوگوں کے خورد ونوش اور رہائش کا انتظام خود کرے تو اس صورت میں ان پناہ گزینوں کو معاشی تگ و دو کی مکمل اجازت دینا حکومت کی ذمہ داری ہوگی، البتہ ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار بننے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا باضابطہ حق نیز وہاں کے سرکاری اسپتالوں میں علاج ومعالجہ کے سلسلے میں تمام شہریوں کی طرح حق، روزگار کا حق سرکاری طور پر حق ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقلی کا حق، یہ تمام حقوق وہ ہیں جو ان پناہ گزینوں کو اس وقت حاصل ہونگے جب وہاں کی حکومت ان لوگوں کو اس کی اجازت قانونی طور پر دے دے۔

البتہ حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جب ان لوگوں کو وقتی طور پر ہی سہی اگر ملک میں رہنے کی اجازت دی ہے تو دامے درمے ان کی مدد کرے ان کے بچوں کی تعلیم کی فکر کرے، حفظان صحت کے سلسلے ان کی مدد کریں ان کے دوا وعلاج کا مفت انتظام کرے موسم کی شدت وحدت کے دنوں میں ان کا خاص خیال رکھے، اور اس سلسلے میں یہ کوشش بھی کرے کہ اگر ان کی ضروریات پوری نہ کر سکے تو متمول اسلامی ممالک سے تعاون کی درخواست کرے اور اقوام متحدہ کے مالی فنڈ سے ان کی مدد کرائے ان کے لئے انسانیت نوازی کا پورا ثبوت دے۔

اس سلسلے میں حکومت اور وہاں کے باشندوں کی ذمہ داری ہے کہ اگر چہ وہ لوگ وہاں کے حقیقی شہری نہیں ہیں لیکن اسلام نے ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان سے اخوت کے رشتے سے جوڑ دیا ہے اس لیے ان پناہ گزینوں کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان سے تعصب نہ برتیں۔

البتہ ان پناہ گزینوں کو وہ سارے حقوق حاصل نہیں ہو سکتے جو وہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں مثلا پناہ گزینوں کو اراضی کی خریداری کی اجازت بغیر حکومت کی اجازت حاصل کئے نہیں ہوگی۔ اگر حکومت نے ان کو کیمپ رہنے کے لئے فراہم کر دیا ہے اور انہیں کیمپوں میں رہنے کا ان کو مکلّف بنایا ہے تو

ان کو پختہ مکان بنانے کی اجازت نہ ہوگی۔ سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، نیز وہ تمام حقوق جو خالص وہاں کے اصل شہریوں کے لئے خاص کئے گئے ہیں وہ حقوق ان پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے، ہاں اگر حکومت اجازت دے دے تو پھر وہ لوگ بھی ان مراعات اور سہولیات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

نوٹ: پناہ گزینوں کے متعلق اس حکومت کی جس حکومت نے ان لوگوں کو پناہ دی ہے یہ ذمہ داری بنتی ہے:

(۱) پناہ گزینوں کے ساتھ انسانی ہمدردی کا اظہار قولا و عملا کیا جائے۔

(۲) ان کو اسلامی ریاست کا عارضی شہری مانا جائے۔

(۳) ان کے ساتھ بہتر سیاسی وسماجی تعلقات قائم کئے جائیں۔

(۴) ان لوگوں کی عزت اور جان ومال کی حفاظت کی جائے۔

(۵) ان لوگوں میں اگر آپسی اختلاف اور نزاع پیدا ہو تو عدالت کے ذریعہ اس کا تصفیہ کرایا جائے۔

(۶) ان لوگوں کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جو ظلم وناانصافی پر مبنی ہو۔

(۷) ان لوگوں کی طرف سے حکومت پر زور وکالت کرے تاکہ دوبارہ ان لوگوں کو اپنے ملک میں بسنا آسان ہو سکے، اس سلسلے میں حکومت اس ملک کے سربراہوں سے پوری جرأت کے ساتھ گفتگو کرے اور ان کو ظلم وبربریت سے روکے۔

الغرض پناہ گزینوں کو جو حقوق حاصل ہونے چاہئیں وہ مختصراً یوں ہیں۔

(۱) ضمیر کی آزادی

(۲) زبان کی آزادی

(۳) زندگی گزارنے کی آزادی

(۴) رہائش اور امن وامان کا حق۔

غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا کیسا ہے؟ کسی مسلمان کے لئے مجبوری اور ضرورت شدیدہ کی بنا پر غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اسلام میں گنجائش نظر آتی ہے، عام حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ حدیث کی مشہور کتاب ابوداؤد میں حضرت سمرہ بن جندب کی روایت موجود ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من جامع المشرك وسكن معه فانه مثله" جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے۔ (ابوداؤد کتاب الضحایا)

حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: "أنا بريء من كل مسلم يقيم بين اظهر المشركين قالوا يا رسول الله! لم؟ قال لا ترى ناراهما" میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ تم یہ امتیاز کرسکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے۔''

امام خطابیؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ،

''مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے۔ چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے، دونوں کے مختلف اُحکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دارالاسلام اور دارالکفر دونوں کو علیحدہ کر دیا ہے، لہذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے یہ بھی انہیں میں سے ہیں۔ علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دارالکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے۔ (معالم السنن للخطابی صفحہ ۴۳۷ جلد ۳ بحوالہ فقہی مقالات)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو''

یہی وجہ ہے کہ عام حالت میں مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے البتہ مخصوص حالات میں ضرورت شدیدہ کی بنا پر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔ نیز غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کے مقصد سے بھی وہاں قیام کی گنجائش فقہاء نے دی ہے۔

غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے بدل بھی سکتا ہے چنانچہ فقہاء کے یہاں ایک مشہور قاعدہ ہے" لا ینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں فقیہ عصر جناب مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی کی ایک چشم کشا تحریر بھی پیش خدمت کر دی جائے۔ مولانا عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

''کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو مستقل مسکن بنا لینا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض و مقاصد کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے۔ مثلا اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جا رہی ہو یا اس کو جیل میں ظلما قید کر لیا جائے یا اس کی جائیداد ضبط کر لی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کر لے کہ وہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہو جائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہو جائے ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بناء پر وہ وہاں رہائش اختیار کر لے

تو مذکورہ بالا دو شرائط (جن کا بیان نمبر ایک میں گزرا) اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے هو الذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبها وکلوا من زرقه والیه النشور " وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا، اب تم اس کے راستوں میں چلو، اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے (سورہ ملک)

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شریعت پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے بلکہ باعث اجر و ثواب ہے چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، اور جو بعد میں ان کے فضائل و مناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی۔

اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لیے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات و منکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلا ضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش و عشرت اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دارالکفر کی شہریت اور قومیت کو دارالاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقا حرام ہے۔ جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں۔ (فقہی مقالات جلد اول)

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کی مستقل شہریت کا شرعی حکم: سرزمین حجاز مقدسہ میں غیر مسلموں اور اہل کتاب کو مستقل یا عارضی شہری کی حیثیت سے آباد کرنا کسی حال میں درست نہیں ہے، کیوں کہ

آنحضرت ﷺ کا حکم ہے کہ انہیں سرزمین حجاز سے باہر نکال دو، ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "لا یجمع فی الجزیرة دینان" جزیرۂ عرب میں دو دین ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے یعنی اسلام اور کفر ایک ساتھ اکٹھا نہیں ہو سکتے۔

علامہ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

لقد صح أن الرسول ﷺ قال "لا یجمع فی الجزیرة دینان" وصح عنه ایضا أنه أمر بإخراج الیهود والنصاری من الجزیرة وأمر أن لا یبقی فیها إلا مسلم، واوصی عند موته علیه الصلاة والسلام باخراج المشرکین من الجزیرة فهذا أمر ثابت عن رسول الله ﷺ ولیس فیه شك والواجب علی الحکام أن ینفذوا هذه الوصیة کما نفذها خلیفة المسلمین عمر رضی الله عنه باخراج الیهود من خیبر واجلائهم۔

فعلی الحکام فی جمیع اجزاء الجزیرة علیهم جمیعا أن یجتهدوا اکثر فی اخراج النصاری والبوذیین والوثنیین والهندوس وغیرهم من الکفرة وألا یستقدموا إلا المسلمین۔ هذا هو الواجب وهو مبین بیانا جلیا فی قواعد الشرع لحنیف۔ فالمقصود والواجب اخراج الکفار من الجزیرة وأن لا یستعمل فیها إلا المسلمون من بلاد الله، ثم إن علیهم ایضا أن یختاروا من المسلمین ..... اما الکفار فلا أبدا إلا عند الضرورة الشرعیة أی التی یقدرها ولاة الأمر وفق شرع الإسلام وحده۔ (مجموع فتاویٰ سماحة الشیخ ابن باز الجزء الثانی)

ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"ومن المعلوم أن هذا الجزیرة لا یجوز أن یقیم بها غیر المسلمین لأن الرسولؐ اوصی بإخراج الکفار من الجزیرة، فلا یدخلوها إلا لحاجة عارضة، فلا یجوز استقدامهم ولا السماح بهم بذلك، فالحاصل أن الجزیرة العربیة لا یجوز أن یقر فیها دینان، لانها معقل الاسلام ومنبعه ومهبط الوحی فلا یجوز أن یقز فیها المشرکون إلا بصفة مؤقتة لحاجة یراها ولی الأمر ..... وهم الرسل الذین یقومون من دول کافرة لمهمات وکباعة المیرة ونحوها ممن یجلب إلی بلاد المسلمین ما یحتاجون الیه ویقیم ایاما لذلك ثم رجع إلی بلاده حسب التعلیمات التی یضعها ولی الأمر" (مجموع فتاویٰ سماحة الشیخ ابن باز)

ان دو فتاوے کی روشنی سے یہ بات بالکل طے ہوگئی کہ جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کا عارضی یا دائمی شہریت حاصل کرنا کسی طرح درست نہیں ہے سوائے بعض مخصوص حالات کے جن کا اوپر ذکر ہوا اور وہ بھی صرف محدود وقت کے لئے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا۔

جہاں تک جزیرۃ العرب کے علاوہ دیگر مسلم ملکوں کا مسئلہ ہے تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ ضرورت کی بنیاد پر مسلم ملکوں میں

غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے (اگر وہ ذمی یا ولاء کے طور پر رہنا چاہیں) آباد کر سکتے ہیں اگر ان سے وہاں کے مسلمانوں کو دینی ملی اور شرعی اعتبار سے کوئی نقصان نہ ہو اور یہ امید ہو کہ وہ مسلمان ملک میں رہیں گے تو ان کو اسلام کی طرف بلانا آسان ہوگا، یا وہ خود اسلام کے نظام و اخلاق دیکھ کر اسلام قبول کر لیں گے۔

لیکن یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ کمپنی یا دیگر شعبوں میں ملازمت کے لئے پہلے مسلمانوں کو تلاش کیا جائے نہ ملنے پر غیر مسلموں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

عرب ملکوں میں ضرورت کی بناء پر جن غیر مسلموں کو رہائش کی اجازت مل سکتی ہے ان کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن نہ ہوں یا ان سے برسر جنگ نہ ہوں، چونکہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک، اور عدل کرنے سے نہیں روکتا بلکہ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات سے روکتا ہے جو مسلمانوں کے خلاف برسر جنگ ہوں اور ان کے خلاف جارحیت اختیار کریں۔

اگر ضرورت شدیدہ کی بناء پر غیر مسلموں کو شہریت کی اجازت دینی ہی پڑ جائے تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان میں دعوت و تبلیغ سے غافل نہ ہوں اور اسلام کے محاسن کو بیان کرنے سے پیچھے نہ رہیں۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں علامہ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الطريق لهذا السبيل اليه هو دعوة غير المسلمين إلى الخير والهدى، وأن يفسر لهم ما جاء به الرسل ﷺ من الهدى ودين الحق بالأسلوب الذى يفهمونه وبيان محاسن الإسلام لهم لعلهم يدخلون فى دين الله ولعلهم يخرجون من ظلمات الشرك والجهل والظلم إلى نور التوحيد والايمان وعدالة الاسلام. فمن قبل الحق واستقام على دين الله فالحمدلله وإلا امكن ابعاده إلى بلاد الكفرة إذا كان ليس من اهل الكتاب ولا من المجوس، وإذا كان من المجوس او من اهل الكتاب توخذ منهم الجزية ويبقى فى صغار وذل حتى يدخل فى دين الله ويسلم الناس من شره ويعرفونه۔ .....۔

..... وهذا كله فى غير الجزيرة العربية أما فى الجزيرة العربية فالواجب أن يمنعوا من دخولها وأن لا يبقوا فيها" (مجموع فتاویٰ ابن باز)

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ عرب ملکوں (جزیرۃ العرب کو چھوڑ کر) میں بھی شہری کے طور پر صرف اہل کتاب اور اہل مجوس ہی رہ سکتے ہیں وہ بھی خاص شرطوں کے ساتھ۔ غیر مسلموں یعنی مشرکوں کو اگر مجبوری کی بنا پر قیام اور شہریت کے اجازت دے دی بھی گئی تو بھی حکومت کو حق ہے کہ ان کو اسلامی ملکوں سے ضرورت ختم ہونے پر باہر کر دے اور شریعت نے بھی اس کی اجازت دی ہے البتہ جب تک وہ رہیں گے ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے گا اور ان کو تمام جمہوری اور دستوری حق حاصل ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

بحث وتحقیق

مستشرقین اور حدیث

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

استشراق کی ابتداء:

صلیبی جنگوں میں جو عیسائی فوجیں مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہیں ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔

کچھ تو ان جنگوں میں اپنے دینی جذبات کی بنیاد پر شامل ہوئے تھے، اس لیے کہ ارباب کلیسا نے عیسائی عوام کے ذہنوں میں مسلمانوں کے خلاف دین کی اندھی عصبیت کا زہر اس طرح بھر دیا تھا کہ وہ گہوارۂ مسیح کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھڑانے کے لئے ہر قیمت چکانے کو تیار تھے۔

دوسرے کچھ لوگ اپنے سامراجی اور سیاسی مقاصد کی وجہ سے ان جنگوں میں شامل ہوئے، کیوں کہ یوروپی حاکموں اور فرمانرواؤں نے مسلم ممالک کی زرخیزی و شادابی، تہذیب و تمدن، دولت و ثروت، صنعت و پیداوار اور خوشحالی و فارغ البالی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، جس کی وجہ سے اسلامی ممالک پر قبضہ کرنے اور وہاں کی دولت وثروت ہڑپ کرنے کا لالچ و داعیہ ان کے دلوں میں پیدا ہوا، ان حضرات نے مذہب اور حضرت مسیح کے نام کا استعمال کر کے اپنے اس سامراجی منصوبے میں رنگ بھرا۔

صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کو فتح تو نصیب نہیں ہوئی مگر وہاں کی تہذیب وتمدن کے نقوش ان کے دلوں پر ثبت ہوگئے، جب وہ واپس آئے تو اس عزم مصمم کے ساتھ کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے اور کتنا ہی وقت گزر جائے ان اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنا ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے اسلامی ممالک کے حالات وعقائد کا مطالعہ شروع کیا تا کہ اس کے ذریعہ ایک فکری جنگ برپا کی جائے۔

دراصل یہیں سے مستشرقین کا بیج پڑا، اور وہ آج تک اپنا کام مسلسل کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو عیسائی تھے اور کچھ یہودی، جو سب اپنی اسلام دشمنی میں معروف ہیں، اگر چہ چند ایک منصف مزاج بھی تھے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے، اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ اسلام میں تحریف کی جائے اور دنیا کے سامنے اس کی شبیہ مسخ کر کے پیش کی جائے۔

مستشرقین کی خصوصیات:

مستشرقین کی تحقیقات ومباحث کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلام کے اہداف ومقاصد اور اس سے متعلق ہر چیز کے بارے میں غلط فہمی اور بدگمانی۔

۲۔ عظیم مسلم شخصیات کے تعلق سے بدگمانی۔

۳۔ ہر دور اور خاص کر قرن اول کے مسلم معاشرہ کی اس طرح تصویر کشی جس سے یہ تأثر پیدا ہو کہ وہ معاشرہ انتشار و پراگندگی اور انانیت وخودغرضی کا شکار تھا۔

۴۔ اسلامی تہذیب کی غلط تصویر کشی جس کا حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔

۵۔ مسلم معاشرہ کے حقیقی مزاج سے ناواقفیت، اور مسلمانوں کے ظاہری اخلاق وعادات دیکھ کر اس کے بارے میں زبردستی فیصلہ کرنا۔

۶۔ جس خاص فکر کے وہ حامل تھے اس کے تحت نصوص وعبارات کو زبردستی اس کے مطابق ڈھالنا، جس نص کو جی چاہا رد کر دیا اور جسے جی چاہا قبول کر لیا۔

۷۔ نصوص وعبارات میں دانستہ تحریف کرنا، اور جب ایسا ممکن نہ ہو تو ان عبارتوں کو غلط معانی پہنانا۔

۸۔ جن مراجع ومصادر سے وہ نقل کرتے ہیں ان کی بابت غلط سلط فیصلہ کرنا، مثلاً ادب کی کتابوں سے نقل کر کے تاریخ حدیث کے بارے میں فیصلہ کرنا، یا تاریخ سے نقل کر کے تاریخ فقہ پر حکم لگانا، چنانچہ ایسا کرتے ہیں جیسے مثلاً دمیری نے کتاب الحیوان میں جو نقل کیا اس کی تصحیح کر دی اور امام مالک نے مؤطا میں جو روایت بیان کی اس کی تکذیب کر دی، جیسا جی میں آیا ویسا ہی کر دیتے۔

اسی روح اور اسی فکر کے ساتھ انہوں نے مسلمانوں کے علوم وفنون کا مطالعہ شروع کیا، اور مختلف اسباب نے انہیں اس درجہ تک پہنچا دیا کہ اسلامی علوم کے بارے میں انہیں مرجع کی حیثیت حاصل ہوگئی، حکومت کی امداد، ان کی ذاتی محنت ولگن اور مصادر کی دستیابی نے ان کی بحثوں اور تحقیقات کو علمی رنگ دینے میں مدد کی،

بات یہاں تک پہنچ گئی کہ مغربی تعلیم یافتہ حضرات ان مستشرقین پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرنے لگے، ان سے نقل و استفادہ پر فخر جتانے لگے، انہی میں کچھ ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے ان حضرات کی تحقیقات کو اسلامی لباس پہنانے کی کوشش کی، احمد امین نے ''فجر الاسلام'' میں جو کچھ کیا ہے وہ ان مستشرقین کے تلامذہ کے کرتوتوں کی بہترین مثال ہے۔

گولڈ زیہر کی حدیث کے بارے میں تشکیک

تشکیک: فتین قسم کے مستشرقین میں گولڈزیہر بھی ہے جس کی عربی مراجع پر گہری اور وسیع نظر تھی، جدید مستشرقین کے نزدیک اس کی کتابیں مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

احمد امین نے فجر الاسلام میں جس طرح اس کے نام کی صراحت کرتے ہوئے اس کے کچھ افکار نقل کئے ہیں اسی طرح بہت سی جگہ بغیر صراحت کے بھی اس کی آراء پیش کی ہیں۔

حدیث کی تاریخ کے سلسلہ میں اس مستشرق نے جو شبہات واعتراضات اٹھائے ہیں ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے اپنی کتاب ''نظرة عامة فی تاریخ الفقه الاسلامی'' میں انہیں نقل کیا ہے۔

اس مستشرق نے اپنی کتاب ''العقیدة والشریعة فی الاسلام'' میں بھی تاریخ حدیث کے سلسلہ میں اپنے افکار کا خلاصہ بیان کیا ہے، اس کتاب کا ترجمہ استاد محمد یوسف موسی، عبدالعزیز عبدالحق اور علی حسن عبدالقادر نے کیا ہے۔

گولڈ زیہر کے پیدا کردہ شبہات:

(ہم بہت ہی اختصار کے ساتھ پہلے نمبروار اس کے شبہات پیش کرتے ہیں پھر ترتیب سے جوابات درج کریں گے)

(۱) حدیث کا بڑا حصہ اسلام کے عہد طفولیت کے بعد اس کے عہد جوانی میں گھڑا گیا ہے، یعنی حدیث کی بڑی تعداد اس دور کی پیداوار ہے جب اموی حکمرانوں اور علماء کرام کے درمیان مخاصمت وجدال شروع ہوا، ان علماء کو حدیث کی جمع وتدوین کے دوران جب حدیث کے موجودہ ذخیرہ سے اپنے مقاصد کی تکمیل ہوتی نظر نہ آئی تو انہوں نے جھوٹی حدیثوں کا سہارا لیا۔

(۲) اموی حکومت اور متقی علماء کے درمیان لڑائی جھگڑا اور ان کی باہمی دشمنی وضع حدیث کا سبب بنی۔

(۵) اموی علویوں کے دشمن تھے، اور علماء کی امویوں سے دشمنی تھی، اس لیے ان علماء کو علویوں سے بڑی امیدیں تھیں، چنانچہ یہ علماء زیادہ تر مدح اہل بیت (علویوں کی تعریف میں) میں حدیثیں وضع کرتے، اور اس طرح بالواسطہ امویوں کی بھی ہجو ہو جاتی۔

(۳) یہ دشمنی امویوں اور علماء مدینہ کے درمیان تھی، اور علماء مدینہ نے ہی امویوں کا مقابلہ کرنے کے لئے وضع حدیث کی تحریک شروع کی تھی۔

(۴) ان علماء نے ایسی حدیثیں گھڑیں جن سے ان کا کام بھی ہو جائے اور کسی شرعی اصول پر آنچ بھی نہ آئے۔ یعنی علماء نے دفاع عن الدین کے لئے حدیثیں گھڑی۔

(۸) اموی حکومت نے حدیثیں وضع کیں اور کروائیں اس کی دلیل کے طور پر موصوف مستشرق نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: علیؓ اور اصحاب علی کو سب وشتم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو، ان کی احادیث سے صرف نظر کرو اور حضرت عثمانؓ کے حق میں دعائے رحمت کرتے رہو اور ان کی طرف کان لگاؤ۔

(۶) ان علماء کے جواب میں اموی حکومت نے بھی حدیثیں وضع کیں اور کروائیں۔

(۷) حدیث کی بڑی تعداد گھڑی ہوئی ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کوئی بھی سیاسی یا اعتقادی اختلافی مسئلہ ہو اس کی بنیاد کسی نہ کسی قوی الاسناد حدیث پر ہی ہوتی ہے۔

ان شبہات کی حقیقت:

(۱) موصوف کا یہ شبہ ہی غلط ہے کہ اسلام اموی دور میں جا کر درجۂ کمال کو پہنچا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اموی دور سے پہلے ہی (دور نبوت میں) اسلام کمال کے آخری درجہ تک پہنچ چکا تھا، جبھی تو عمر رضی اللہ عنہ قیصر وکسری جیسی حکومتوں پر قابض ہو سکے اور ان پر حکومت کر سکے، اگر اسلام بچہ ہوتا تو عمر اس وسیع سلطنت کا بار کیسے سنبھالتے۔

دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمانوں کا طرز عبادت، ان کے احکام وقوانین اور اجتماعی ومعاشرتی بنیادیں یکساں تھیں، جس وقت ان لوگوں نے جزیرۂ عرب کو خیر باد کہا تھا اگر وہاں اسلامی نظام مکمل ومضبوط نہ ہوتا تو یہ یگانگت واتحاد کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ کیوں کہ شمالی افریقہ کا جو ماحول تھا وہ چین سے یقیناً مختلف تھا، مگر اس کے باوجود دونوں ملکوں کے مسلمان عبادات و معاملات وغیرہ میں متحد تھے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسلام اس وقت بھی مکمل تھا۔

پہلی صدی کے بعد جو مختلف فقہی مذاہب رونما ہوئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اسلام کی ترقی کا اثر تھا بلکہ حقیقت میں یہ سارے مذاہب صحابہ کے اقوال پر مبنی تھے، اور صحابہ کا اختلاف بالکل ابتدائی دور کا ہے، لہذا فقہی مذاہب کا وجود اور ان کا تنوع اسلام کی ترقی کے سبب سے نہیں بلکہ وہ تو قرآن وحدیث اور ان کے فہم میں صحابہ کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ اگر فقہی مذاہب کا اختلاف اسلام کی ترقی کا نتیجہ ہوتا تو پھر صحابہ کے درمیان اختلاف نہ ہوتا کہ اس مستشرق کے بقول اسلام ابھی عہد طفولیت میں تھا۔

(۲) گولڈ زیہر نے اموی حکمرانوں کی کچھ اس طرح تصویر کشی کی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سامراجی غلبہ کے حریص اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف تھے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو قابل ذکر یہ ہے کہ امویوں کے بارے میں زیادہ تر روایات عباسی دور کی وضع کردہ ہیں، جن پر بلا تحقیق اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے قطع نظر بھی تاریخ میں ایسی بہت سی روایات ملتی ہیں جن سے اس اعتراض کی قلعی کھل جاتی ہے کہ اموی اسلام سے منحرف تھے، مثلا ابنِ سعد نے ذکر کیا ہے کہ لوگ عبدالملک کو اس کی کثرت عبادت کی وجہ سے حمامۃ المسجد (مسجد کا کبوتر) کہتے تھے۔

ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ صحابہ کے بعد ہم کس سے سوال کیا کریں تو آپ نے عبدالملک کی طرف اشارہ کیا۔ جس وقت لوگ عبدالملک سے بیعت کرنے آئے تو وہ تلاوت میں مشغول تھا۔

ولید کے زمانہ میں بہت سی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ یزید بن معاویہ کے علاوہ تقریبا تمام ہی اموی خلفاء کا یہ حال تھا۔

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ فتوحات کا دائرہ جتنا کچھ وسیع ہونا تھا وہ اموی دور میں ہی ہوگیا، عباسی دور میں اس میں کچھ بھی اضافہ نہ کیا جا سکا، اور ان تمام جنگوں میں خلفاء بنوامیہ کی آل اولاد پیش پیش تھی جس سے ان کے جذبۂ جہاد کا پتہ چلتا ہے۔

ان تمام اشارات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اموی حکمراں اسلام کی ترقی کے لئے کس قدر فکرمند اور کوشاں تھے، ان کے دلوں میں اسلام اور اسلامی قوانین کا کتنا احترام تھا، اور جب بات یہ تھی تو پھر علماء ان سے دشمنی کیوں کرنے لگے؟

لہذا اموی حکمرانوں اور علماء کرام کے درمیان جس دشمنی کو بنیاد بنا کر موصوف نے وضع حدیث کا دعوی کیا ہے وہ بنیاد ہی کھوکھلی ہے۔

امویوں سے مخاصمت وعداوت تو تھی مگر ان علماء کرام کی نہیں، بلکہ شیعہ اور خوارج کی تھی، اور ظاہر ہے کہ جن نفوس قدسیہ نے حدیث کی جمع وتدوین کی خدمت انجام دی وہ شیعہ اور خوارج نہیں تھے، اور وضع حدیث کا الزام موصوف نے حدیث کی تدوین کرنے والوں پر ہی لگایا ہے۔ چنانچہ سعید بن میبّب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، سالم، نافع، سلمان بن یسار، قاسم بن محمد بن ابی بکر، امام زہری، عطاء، شعبی، علقمہ، حسن بصری اور دوسرے وہ ائمہ حدیث جنہوں نے تدوین حدیث کا کام کیا وہ امویوں سے کبھی معرکہ آراء نہیں رہے۔

اور سعید بن میبّب کی عبدالملک سے جو جفاء رہی تو اس کا سبب یہ تھا کہ عبدالملک بیک وقت اپنے بیٹے ولید اور اس کے بعد سلمان دونوں کی بیعت لے رہا تھا اور آپ منع کررہے تھے،

اسی طرح حجاج اور بعض علماء کے درمیان جو خصومت رہی تو اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ حجاج امویوں کے مخالفین پر حد سے زیادہ سختی کرتا تھا، نہ کہ اس کا فسق و فجور اس خصومت کا سبب تھا، بلکہ بعض علماء تو اس کی قرآنی خدمات کے معترف وقدرداں تھے۔

خلاصہ یہ کہ جن علماء کی امویوں سے دشمنی تھی اگر ان سے اس مستشرق کی مراد خوارج اور شیعہ ہیں تب تو تسلیم: مگر یہ وہ علماء نہیں جنہوں نے حدیث کی تحقیق وتنقید اور تدوین کا کام انجام دیا، اور اگر اس کی مراد سعید بن مسیّب، حسن بصری، قتادہ، مکحول اور امام زہری جیسے علماء سے ہے تو یہ سفید جھوٹ ہے۔

(۳) اگر علماء مدینہ نے ایسا کیا تو سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت سارے کے سارے علماء مدینہ ہی میں موجود تھے؟ کیا دمشق، کوفہ، بصرہ، مصر اور دوسرے اسلامی شہروں میں صحابہ اور علماء موجود نہیں تھے؟

تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ اس وقت مکہ میں (متأخرین صحابہ کے علاوہ) عطاء، طاؤس، مجاہد، عمرو بن دینار، ابن جریج اور ابن عیینہ جیسے تابعین موجود تھے۔

اور بصرہ میں حسن بصری، ابن سیرین، مسلم بن یسار، ایوب سختیانی، اور کوفہ میں علقمہ، اسود، عمرو بن شرحبیل، سعید بن جبیر، اور قاسم بن عبدالرحمٰن اور شام میں ابوادریس خولانی، قبیصہ بن ذویب، سلیمان بن حبیب، خالد بن معدان اور مکحول۔ اور مصر میں یزید بن أبی حبیب، عمرو بن حارث، لیث بن سعد، عبیداللہ بن ابی جعفر اور یمن میں مطرف وغیرہ کبار علماء موجود تھے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا تحریک وضع حدیث میں علماء مدینہ کے ساتھ یہ علماء بھی شامل تھے؟ وہ کانفرنس کہاں ہوئی جس میں یہ سب جمع ہوئے؟ اور اگر یہ علماء شریک نہیں تھے تو پھر یہ خاموش کیسے رہے؟ اور علماء مدینہ کی مرویات انہوں نے نقل کیوں کیں؟ اور علماء مدینہ کے خلاف ان حضرات نے کوئی نکیر کیوں نہیں کی؟ اگر نکیر کی تو تاریخ میں اس کا ثبوت کیوں نہیں؟ بلکہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ تمام بلاد وامصار کے علماء یہ اعتراف کرتے تھے کہ حجاز کی حدیثیں سب سے زیادہ صحیح ہوتی ہیں، اور خود عبدالملک علماء مدینہ کی صحت حدیث کا معترف تھا۔

اس دعوی کا کھوکھلا پن یہاں سے اور واضح ہوجاتا ہے کہ یہ مستشرق سعید بن مسیّب اور امویوں کے درمیان دشمنی کو ہی بنیاد بنا کر علماء مدینہ پر وضع حدیث کا الزام لگاتا ہے مگر وضع حدیث میں سعید بن مسیّب کے کسی رول کا تذکرہ نہیں کرتا، اگر بات یہی تھی تب تو سعید بن مسیّب کو وضاعین میں سرفہرست ہونا چاہیے تھا کیوں کہ اصل دشمنی تو انہی کی تھی۔

اب دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں! یا تو یہ سعید بن مسیّب پر وضع حدیث کا جھوٹا الزام لگاتا ہے لیکن صاف صاف کہنے کی جرأت اس لئے نہ ہوسکی کہ کوئی روایت چاہے ضعیف ہی سہی، اسے اپنے دعوی کے ثبوت میں نہ مل سکی، یا یہ سعید بن مسیّب کو اس تہمت سے بری قرار دیتا ہے، مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ جن علماء پر یہ وضع کا الزام لگا رہا ہے سعید بن مسیّب ان کے سردار ہیں، اس طرح مدعی خود اپنے دعوی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

(۴) نیک مقاصد کے لئے حدیثیں گھڑنے کا علماء پر الزام لگا کر گویا موصوف نے علماء کی مجبوری اور ان کی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مگر یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو ہمارے علماء کی بلند کرداری اور عظمت سے ناواقف ہے، اور جو یہ نہیں جانتا کہ ہمارے یہ علماء عام بول چال میں بھی جھوٹ بولنے سے کوسوں میل دور تھے، اور رسول اکرم ﷺ پر جھوٹ بولنے کو تو اتنا سنگین اور گھناؤنا جرم سمجھتے کہ بعض کے نزدیک ایسا کرنے والا کافر ہے اس کو قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

اگر یہ مستشرق ہمارے علماء کی ان خصوصیات سے ناواقف ہے تو کسی حد تک معذور بھی ہے، مگر مشہور کہاوت ہے کہ جھوٹا دوسروں کو خود سے بڑا جھوٹا سمجھتا ہے، اور چور سب کو چور ہی گمان کرتا ہے۔ ورنہ اس طرح کی بات کون کہہ سکتا ہے کہ سعید بن مسیّب جو خلاف سنت ہونے کی وجہ سے ایک وقت میں دو بیعتیں کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کی وجہ سے تحقیر و تذلیل تک برداشت کرتے ہیں وہی سعید بن مسیّب اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کے دفاع کے لئے حدیثیں گھڑنے کو جائز سمجھ لیتے ہیں۔ اور جو حضرات ہر مخالف سنت عمل پر نکیر کرتے ہیں وہی آگے چل اس بات صحیح سمجھ لیتے ہیں کہ کچھ باتیں اپنی طرف سے کہہ کر حدیث کے ذخیرہ میں شامل کر دیں۔

(۵) موصوف نے جس طرح علماء پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ دین کے دفاع کی خاطر حدیثیں وضع کرتے اسی طرح یہ بھی بہتان تراشی کی ہے کہ ان علماء کو علویوں سے امیدیں وابستہ تھیں اس لئے ان کی تعریف میں جھوٹی حدیثیں بیان کرتے، گویا مدح اہل بیت میں حدیثیں وضع کرنے والے یہی علماء کرام ہیں۔

پہلی بات تو سمجھنے کی یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بعض صحابہ کی مدح کی ہے، اور حضور پاک علیہ السلام نے بھی حضرت علی کی مدح وفضیلت بیان کی ہے جیسا کہ بعض دوسرے صحابہ مثلاً ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کے بارے میں آپ نے خصوصی فضائل بیان فرمائے۔

لہذا یہ بات تو طے ہے کہ کبار صحابہ (جن میں اہل بیت بھی شامل ہیں) کی فضیلت پر دلالت کرنے والی حدیثوں کا ایک حصہ بالکل صحیح ہے، مگر یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان میں کچھ حدیثیں موضوع اور جھوٹی بھی ہیں۔

لیکن وہ علماء کرام کی وضع کردہ نہیں ہیں، بلکہ شیعہ فرقہ کی طرف سے گھڑی گئی ہیں، علماء اہل سنت نے تو شیعوں کی طرف سے برپا کی گئی اس تحریک وضع کا مقابلہ کیا اور موضوعات کی نشاندہی کی، اور اسناد کا سلسلہ شروع کیا، اور بقول ابن سیرین، راوی اگر صحیح العقیدہ ہوتا تو اس کی روایت قبول کی جاتی اور اگر اہل بدعت میں سے ہوتا تو رد کر دی جاتی۔

یہ اہل بدعت کون؟ یہ شیعہ اور خوارج وغیرہ ہی ہیں۔

اگر علماء اہل سنت اس تحریک وضع میں شامل ہوتے تو شیعوں اور دوسرے وضاعین کا مقابلہ کرنے کے بجائے ان کا ساتھ دیتے، آخر انہوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟

اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ابن ابی الحدید جیسے شیعی عالم خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ حدیث میں سب سے پہلے جھوٹ بولنے والے اور اہل بیت کی مدح میں حدیثیں گھڑنے والے شیعہ ہیں، اور موصوف یہ الزام علماء اہل سنت پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا یہ تاریخی حقائق میں تحریف نہیں ہے؟

(۶) یہ بات کہ اموی حکومت نے بھی یہ گھناؤنا کام کیا

بالکل انوکھا، نرالا اور نیا دعوی ہے، جو موصوف کے ذہن کی اختراع ہے۔

تاریخ سے اس کا کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟ حکومت کی جانب سے وضع کردہ احادیث کہاں ہیں؟ ہمارے علماء حدیث کو مع سند نقل کرتے رہے ہیں، احادیث کی ان ہزاروں سندوں میں کوئی ایک بھی سند نہیں جس میں عبدالملک، یزید، ولید یا حجاج اور خالد بن عبداللہ قسری وغیرہ ہوں، ایسا کیوں ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ حکومت نے دوسروں سے یہ کام کروایا تو اس کی کیا دلیل ہے؟

(۷) مختلف فیہ مسائل کی بنیاد کسی نہ کسی صحیح حدیث پر ہی ہوتی ہے، اس طرح صحیح حدیثوں میں بھی باہمی اختلاف پایا جاتا ہے، مگر حدیثوں کے اختلاف کو ان کے موضوع ہونے کی دلیل بنانا علمی خیانت ہے۔

حدیثوں میں یہ اختلاف کیوں ہے؟ اس کے اسباب بہت سے ہیں، علماء نے ان کو بالتفصیل بیان کر دیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ حضور پاک نے کوئی عمل دو مختلف حالتوں میں دو مرتبہ الگ الگ انداز سے کیا، ایک صحابی نے پہلے عمل کو بیان کر دیا اور دوسرے نے دوسرے عمل کو، جیسے الوضوء من مس الذكر اور هل هو الا بضعة منك۔

۲۔ آپ نے ایک ہی عمل کو دو طرح سے کیا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں، ایک صحابی نے اس عمل کی پہلی صورت کو اور دوسرے نے دوسری صورت کو بیان کیا۔ جیسے وتر کے بارے میں یہ اختلاف کہ وہ سات رکعت ہے یا نو یا گیارہ۔

۳۔ نص کو سمجھنے میں اختلاف، کسی نے وجوب سمجھا اور کسی نے استحباب۔

۴۔ ایک صحابی نے نیا حکم سنا جس نے پہلے حکم منسوخ کر دیا جبکہ دوسرے صحابی اس سے ناواقف رہے، اس طرح پہلے والے نے ناسخ حکم کو بیان کیا جبکہ دوسرے صحابی پہلے والے کو بیان کرتے رہے (جو کہ منسوخ ہو چکا تھا)

ان کے علاوہ بھی بہت سے اسباب ہیں، جن سے متعلق امام شافعی، ابن قتیبہ اور امام طحاوی وغیرہ علماء کرام نے مستقل کتابیں تصنیف فرما دی ہیں۔

(۸) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں آخر اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ نے حضرت مغیرہؓ کو حضرت علیؓ اور ان کے اصحاب کی مذمت اور حضرت عثمانؓ و اصحاب عثمان کی مدح میں جھوٹی حدیثیں بیان کرنے کا حکم دیا، جو بات آپ نے کہی وہ تو ہر حکومت اپنے مخالفین کے بارے میں کہتی ہی ہے، کہ مخالفین کی باتوں پر کان نہ دھرو۔

یہ تو اس دلیل کی حقیقت ہوئی، مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ موصوف نے حضرت معاویہؓ کے اس قول میں بڑی تحریف کی ہے، اور (مستشرقین کی عادت کے مطابق) "الا قصاء" کے لفظ کو " ان تضطهد من أحاديثهم" سے بدل دیا، احادیث کا لفظ (طبری کی جس سے موصوف نے نقل کیا ہے) اصل عبارت میں کہیں موجود ہی نہ تھا، بالفرض اگر موجودہ ہو بھی تو اس سے مراد عام بول چال اور گفتگو ہے نہ کہ آپ ﷺ کے ارشادات۔

یہ ہے ان مستشرقین کی علمی امانت!!!

(السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی: مصطفیٰ سباعی)

☆☆☆

تربیت اولاد (قسط-۲)

بچہ کے غصہ کے ساتھ کیسے برتاؤ کریں!

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بچہ کھیل کود میں مشغول ہوتا ہے اور یہ حالت اس کے لیے بڑی خوش کن ہوتی ہے، کہ اچانک اس کی ماں آتی ہے اور کہتی ہے کہ بیٹا اب آپ کپڑے پہن کر تیار ہوں، بعض ضروریات کی خرید وفروخت کیلئے بازار جانا ہے، بچہ فوراً انکار کرتا ہے کیوں کہ اس وقت اس کے نزدیک اس کا کھیل بازار جانے سے زیادہ اہم ہے، اس صورت میں بچہ اور ماں دونوں کی طرف سے غصہ کا اظہار ہوتا ہے، اور پھر ماں کو یہ کہتے ہوئے پایا جاتا ہے کہ اس کا بچہ نہ اس کی اطاعت کرتا ہے اور نہ اس کی معاونت کرتا ہے۔

یہ منظر جو تقریباً ہر روز ہر کسی کے سامنے پیش آتا ہے اس کا تجزیہ ضروری ہے، ظاہر ہے کہ بچہ اپنے کھیل کود میں مسرور ہوتا ہے، اس کو قطعی یہ بات نہیں بھاتی کہ وہ اپنے کھیل کے سلسلہ کو منقطع کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی اس کے بازار جانے کا دل ہی نہ کر رہا ہو، ان دونوں صورتوں میں اس کو غصہ آنا لازم ہے، جہاں تک ماں کے موقف کی بات ہے تو اسکے سامنے گھر کی ضروریات اور اس کے اپنے روزانہ کے معمولات وفرائض ہوتے ہیں اس لیے وہ اس وقت بازار جانا ضروری سمجھتی ہے، جبکہ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ کبھی وہ بازار جانے کے لئے مائل نہیں ہوتی، دونوں کے اپنے موقف کے بعد ہوتا یہ ہے کہ دونوں کا غصہ ٹکراتا ہے اور ماں و بچہ ایسی حالت سے دوچار ہوتے ہیں جس میں دونوں کو بے چینی و بے کیفی ہوتی ہے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس صورت میں دونوں میں سے کس کا موقف درست ہے اس لیے کہ دونوں کی اپنی مصلحتیں اور اپنے موقف ہیں، اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں کہ بچے کو یہ احساس دلایا جائے کہ اس کا غصہ محسوس کر لیا گیا اور اس نے بازار نہ جا کر اچھا نہیں کیا، وہ بالکل تعاون نہیں کرتا ہے اور بہت عاجز کرتا ہے، البتہ ماں سے یہ بات آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو یقیناً غصہ آیا ہے، اور ہم کو بھی اس وقت غصہ آتا ہے جب ہم اپنی خواہش کے مطابق کام نہیں کر پاتے، یہ بات ہمارے لیے ممکن بھی نہیں کہ ہم ہر وقت اپنی خواہش کے مطابق کام کریں، اسی لیے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ جس وقت

موقع ملے اس وقت گھر کی ضروریات خرید لیں۔

یہ بات سمجھنے کی ہے کہ بچے کا غصہ کوئی جادو نہیں ہے جو فوراً زائل ہوجائے گا، ماں کو چاہیے کہ وہ مسلسل یہ تاکید کرتی رہے کہ وہ بچہ کو جب جس طرح کہے بچہ اس کی اطاعت کرتا رہے کچھ دنوں میں وہ خود یہ محسوس کرے گی کہ بچہ میں یہ احساس پیدا ہورہا ہے، یہ احساسات فطری ہیں اور انہیں سمجھا جا سکتا ہے، ماں کے اس طریقہ سے بچہ میں یہ احساسات ضرور پیدا ہوں گے اور وہ کسی نقصان کو بھی نہیں محسوس کرے گا، وقت کے ساتھ وہ یہ بھی سیکھ لے گا کہ وہ اپنے جذبات اور ان کے ردعمل کا اظہار کیسے کرے، البتہ اس وقت ایک نازک نفسیاتی مشکل پیش آتی ہے جب ماں بچے کو یہ احساس دلا دیتی ہے کہ جو بچے اس طرح عاجز کرتے ہیں اور غصہ کرتے ہیں وہ ناپسندیدہ ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ماں تم سے محبت نہیں کرتی کیوں کہ اس کے دل میں تمہارے لیے غصہ اور اس صورت حال کے سبب کھنچاؤ ہے، ظاہر سی بات ہے کہ ہر آدمی کسی نہ کسی وقت تنگی اور کھنچاؤ محسوس کرتا ہے، یہی معاملہ بچہ کا بھی ہوتا ہے بسا اوقات وہ اس کا اظہار کر دیتا ہے اور بعد میں نادم ہوتا ہے، اور کبھی کبھی وہ ان جذبات کو دبا لیتا ہے، یہ دھیان رہے کہ بچے کا اپنے جذبات کو دبا لینا اکثر اس کے لیے خطرناک ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ انسان اگر یہ سوچتا ہو کہ جو جذبات دل میں دبا دیے جاتے ہیں وہ ختم ہو جاتے ہیں یا ان سے چھٹکارا مل جاتا ہے تو یہ غلط فہمی ہے بلکہ وہ دل میں انگڑائی لیتے رہتے ہیں بلکہ کچوکے لگاتے رہتے ہیں، چنانچہ جب بچہ اس حالت سے گزرتا ہے تو متعدد جسمانی اور ذہنی پریشانیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے، مثلاً اس کے اندر یہ بات پیدا ہوسکتی ہے کہ بہت زیادہ چیزوں کو چھپائے اور اپنے جذبات کا بالکل اظہار نہ کرے اور بغیر کسی واضح سبب کے وہ ہر وقت گناہ اور غلطی کے احساس سے دو چار رہنے لگے، پھر وہ ایک داخلی کشمکش کا شکار ہوجائے گا اور ہر وقت اپنے اچھے اور برے مزاج کے بارے میں سوچے گا، اور اس طرح وہ ایک ایسے انسان کی شکل میں پروان چڑھے گا جس کی شخصیت میں دلجمعی و یکسوئی نہ ہوگی، اپنے آپ پر اعتماد بہت کمزور ہوگا، اس نفسیاتی مرض کے ساتھ اس کو بعض جسمانی مشکلات بھی پیش آئیں گی کیوں کہ نفسیاتی زندگی کا جسمانی زندگی سے مضبوط تعلق ہے، بچے میں اس طرح کی پریشانیوں کے سبب جو کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں ان کی علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اس میں سختی جنم لیتی ہے، نرمی پر اس کو قدرت نہیں ہوتی، کھانے کے سلسلہ میں وہ مشکوک رہتا ہے اور اس کو ایک پریشانی سمجھتا ہے، ایسے بچوں میں کمزوری تو عام بات ہے، قابو پانے کی قدرت اور زندگی کا فقدان پیدا ہوجاتا ہے اور نیند میں بھی ایک طرح کی پریشانی پیش آتی ہے۔

اپنے بچے کے غصہ کے ساتھ ماں کیا برتاؤ کرے: عام طور پر عمر کے تیسرے سال میں بچے والدین کے حکم کی خلاف ورزی اور ان کے مطالبات کا انکار شروع کر دیتے ہیں، اس منفی انداز کو آپ ان کے ان جملوں میں سنیں گے، جیسے وہ غصہ کی حالت میں کہتا ہے ''میں آپ کو ناپسند کرتا ہوں، مجھے آپ کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں،

مجھ سے الگ ہٹ جایئے، میں آپ کے پاس نہیں آنا چاہتا یا مجھے آپ سے کوئی محبت نہیں وغیرہ۔۔۔'' ظاہر ہے کہ یہ انداز ماں کی نازک و بے لوث ممتا کو زخمی کرتا ہے، اس منفی اور مخالفت بھرے انداز کو قبول کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے، پھر ماں غصہ ہوتی ہے اور بچے پر چیخ پڑتی ہے ''یہ کیا گندی بات ہے، مجھے نہیں معلوم کہ تم کو کیا ہو گیا ہے، ایسا لگتا ہے تمہارے اندر شیطان داخل ہو گیا ہے، تم پر شیطان کا اثر ہو گیا ہے''، اور پھر ماں اس کو ڈراتی ہے کہ اگر وہ اسی منفی انداز اور اس طرح کے غیر مناسب کلام سے باز نہ آیا تو وہ ایک برا انسان بن جائے گا۔

بچے کے اس ردعمل اور اس طرح کے جملوں سے ماں کو تکلیف ہونا فطری بات ہے لیکن یہ ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جو بچہ یہ جملے اور الفاظ استعمال کر رہا ہے اس میں اتنی عقل ابھی نہیں ہے کہ وہ الفاظ و تعبیرات کا انتخاب کر کے بات کرے جس طرح کہ بڑے کیا کرتے ہیں، اس کو کیا معلوم کہ جو وہ غصہ میں اپنی ماں سے کہے گا کہ میں ''آپ کو پسند نہیں کرتا'' تو ماں پر اس جملے کا کیا اثر ہوگا، یہ بھی امکان ہے کہ اس طرح کے جملے والفاظ بچہ اپنے والدین میں سے کسی کو استعمال کرتے ہوئے سن کر سیکھتا ہو مثلاً ہم کہتے ہیں ''موسم بارش میں ہمیں باہر نکلنا پسند نہیں'' یا ''میں فلاں فلاں کو پسند نہیں کرتا وغیرہ''

ہم میں سے بہت سے افراد یہ جملہ استعمال کرتے ہیں ''میں ناپسند کرتا ہوں'' ظاہر ہے کہ اس سے صرف یہی مراد ہوتا ہے کہ یہ بات یا یہ کام مجھ کو پسند نہیں، کسی کو تکلیف پہنچانا یا پھر کراہت وغیرہ جیسی کوئی بات اس سے مراد نہیں ہوتی البتہ جب یہ جملہ غصہ میں بولا جاتا ہے تو پھر شدید انقباض مراد ہوتا ہے، بچہ بھی جب یہ جملہ منہ سے نکالتا ہے تو ہرگز اس کا مقصد اپنی ماں کو تکلیف پہنچانا اور رنجیدہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ تو صرف اپنے ان جذبات کا اظہار کرتا ہے جو اس میں فوری طور پر اس کی اپنی پسندیدہ مشغولیت کھیل کود وغیرہ سے ماں کے روکنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

اسطرح کے جملوں پر ماں کے غصہ اور ری ایکشن سے بچہ اپنے آپ کو ''برا'' تصور کر سکتا ہے اور اس میں یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے کہ والدین کی اطاعت تو ''اچھے'' بچے کا کام ہے، پھر والدین کی نافرمانی کو وہ محسوس بھی نہیں کرے گا، اور والدین کے اس ری ایکشن کے سبب بچہ ان کے غصے کو بھی نہیں محسوس کرے گا۔ پھر ایسے بچے کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ اس ''اچھے'' بچہ کی طرح بنے لیکن ظاہر ہے کہ وہ اس عمر اور ان حالات میں اپنے آپ کو عاجز تصور کرے گا۔

یہ بہت ضروری ہے کہ بچے کو اپنے جذبات واحساسات کو ظاہر کرنے کی پوری آزادی دی جائے، ورنہ اگر ماں ذرا ذرا سی بات پر غصہ کا اظہار کرے گی مثلاً کوئی اس جیسے جملہ پر وہ غصہ کا اظہار کرے گی اور کہے گی ''بیٹے تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے ساتھ اس طرح بات کرنے کی'' تو اس کا نقصان یہ ہوگا کہ آئندہ زندگی میں وہ اس کے ساتھ مضبوط تعلقات استوار نہیں کر سکے گی، اس لیے کہ اس مرحلہ میں جبکہ بچہ کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہونی چاہیے تو ماں اس پر قدغن لگا رہی ہے اور بچہ پر وہ اپنا حکم اور اپنی مرضی مسلط کر رہی ہے خواہ بچہ کو اس کا

احساس ہو یا نہ ہو، اس صورت میں بہت ممکن ہے کہ بچہ میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ وہ والدین کے ساتھ امن وسکون محسوس نہ کرے اس لیے کہ وہاں حریت تعبیر پر قدغن لگائی جارہی ہے اور وہ یہ محسوس کررہا ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے ہر احساس کو والدین کے سامنے پیش کرسکے۔

یہ بات ضرور ہے کہ بہت سے والدین ایسے ہوتے ہیں جو بچوں سے اس طرح کے جملے سننا پسند نہیں کرتے، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ بچے کو اس کی حدود سکھائیں اور یہ بتائیں کہ بڑوں کا احترام کیسے کیا جاتا ہے اور کیسے ادب کیا جاتا ہے تاکہ وہ بڑوں سے وہی بات کرے جو ان کے شایان شان ہو، ایسے والدین کو سمجھنا چاہیے کہ یہ چیز بچہ میں عمر کے ساتھ آتی ہے، عمر کے اس مرحلہ میں چاہیے کہ بچہ جب یہ کہے ''میں تم کو پسند نہیں کرتا'' یا یہ کہے کہ ''میں آپ کے ساتھ بازار نہیں جانا چاہتا'' تو ماں کچھ یوں جواب دے ''بیٹا لگتا ہے اس وقت تم مجھ سے کچھ غصہ ہو، تم کو مجھ سے کچھ پریشانی ہے.....لیکن سنو بیٹا.....اس وقت ضروریات کے لئے ہمیں بازار جانا ضروری ہے''

کبھی ایسا بھی مرحلہ آتا ہے کہ بچہ اچانک چیختا ہے کہ ''میں چاہتا ہوں کہ تم مرجاؤ ماں'' ماں کو چاہیے کہ بغیر کسی تکدر کے بہت پیار سے کچھ یوں جواب دے ''بیٹا یہ ایسی بھلی بات نہیں جسے کوئی عام انسان بھی زبان سے نکالے، اور سنو آدمی جب مرجاتا ہے تو پھر وہ ہمیشہ کے لئے .....دور..... چلا جاتا ہے پھر کبھی واپس نہیں آتا، میں اگر مرگئی تو پھر تمہاری دیکھ ریکھ کون کرے گا، چلو لگتا ہے تم غصہ ہو اس وقت..... چھوڑو چلو بیٹا اس وقت ہم کو بازار جانا ضروری ہے''۔

یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیے کہ احساس کی نشو ونما انسانی زندگی میں بہت اہمیت کی حامل ہے، یہ ''احساس'' ہی تو ہے جس کی بدولت ہم ایک انسان کو کہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں بہت خوش ہے اور دسرے کو کہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں خوش نہیں ہے، ایسا انسان جو ہر وقت اپنے آپ کو ناپسند کرے یا اسے گناہ، غم اور خوف لاحق ہو تو وہ خوش نہیں رہ سکتا، وہ شخص بھی اپنی زندگی سے متلذذ نہیں ہوسکتا جو ہمیشہ نا امید رہتا ہو یا جسے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع نہ ملتا ہو، یا جسے اس کے گردوپیش کے لوگ زندگی سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دیتے ہوں، اس لیے والدین کے لئے بے حد ضروری ہے کہ وہ جس طرح بچے کی جسمانی، عقلی اور فکری نشو ونما پر توجہ کرتے ہیں اسی طرح پورے اہتمام کے ساتھ ''احساس'' کی نشو ونما پر توجہ مرکوز کریں، (احساس کی نشو ونما پر الگ سے ایک بحث آئے گی)۔

سطور بالا میں پیش کردہ تفصیلات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بچہ کو بالکل بے نکیل چھوڑ دیا جائے، وہ جو چاہے کرے، نہیں! بلکہ اس کو آزادی دینے کی بھی ایک حد ہوگی، جب وہ اس حد سے آگے بڑھے گا تو اس کی تنبیہ کی جائے گی، مثلا اس کو رونے یا اپنے غصہ کے اظہار کے لئے کوئی جملہ منہ سے نکالنے کی آزادی ہے (جس کی تفصیل اوپر گذری) لیکن اس کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی کہ وہ دوسروں کو مارے اور تکلیف پہنچائے سامان کی توڑ پھوڑ کرے، اب اگر وہ اپنے غصہ کے اظہار کے لئے اپنا کوئی کھلونا توڑ ہی بیٹھے تو اسے اس کا نتیجہ سکھانے کے لئے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، ایسا نہ

ہو کہ کوئی اٹھے اور جلدی سے دوسرا دلا لائے، نہیں بلکہ اس کو سیکھنے دیا جائے کہ اس نے غصہ میں جو کیا اس کا نتیجہ ہے کہ اب وہ بغیر کھلونے کے یا ٹوٹے ہوئے کھلونے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہے، اور یہی حرکت اگر وہ دوسروں کے ساتھ کر بیٹھے تو ضروری ہے کہ تنبیہ کے لئے (خواہ صرف دکھانے کے لئے ہو) اس بچہ کو معاوضہ دیا جائے اور ماں یہ کام اس طرح کرے کہ بچہ کو باور ہو کہ اس کی ضرورت کے لئے جو رقم تھی وہ اس حرکت کے نتیجہ میں دوسرے کو دے دی گئی۔ پھر ماں اس کو ڈراتی رہے کہ دیکھو اگر تم ایسا کروگے اور اس طرح غصہ میں کوئی چیز پھینکو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی، پھر تمہیں اس کے بغیر ہی رہنا پڑے گا اور وہ چیز تم کو نہیں مل سکے گی، اس طرح آہستہ آہستہ وہ اپنے اعمال کے نتیجہ پر نظر رکھنا سیکھے گا۔

خاص بات یہ ہے کہ ماں خود بچے کو اظہار غضب کے ایسے طریقے سکھا سکتی ہے جس سے اس کا غصہ نقصان دہ ہونے کے بجائے مفید ہو جائے، مثلاً بچے کو یہ سمجھایا جائے کہ جب تم غصہ کا اظہار کرنا چاہو تو گھر میں دوڑنا شروع کردو، کمروں میں چکر لگاؤ یا تالا وغیرہ بجانے لگو اس طرح اس کے غصہ سے کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ غصہ کھیل اور نشاط میں تبدیل ہو جائے گا۔

خوشی کا فقدان

ایسے جذبات واحساسات جن کے ساتھ زندگی گذارنے کا ہنر سیکھنا بچہ پر ضروری ہے، ان میں ہم تکلیف، بے قراری اور تکلیف پہنچانے کے جذبات کو لے سکتے ہیں، بچہ کو اگر کوئی تکلیف ہو یا کسی وجہ سے بے قرار ہو یا اسے کوئی تکلیف پہنچادے تو اس صورت میں اس کی عمر کے تقاضہ کے مطابق فوری اور فطری ردعمل کے طور پر وہ رونا شروع کر دیتا ہے، یہ بات مسلم ہے کہ رونا جذبات کی تسکین کے لئے مفید ہے، ہر انسان تکلیف وغم میں آنسو بہا کر کچھ نہ کچھ راحت محسوس کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر بچہ سے کہا جائے (لڑکوں سے اکثر کہا جاتا ہے) کہ وہ نہ روئیں، رونا غیر محبوب عمل ہے، اس سے شرمندگی ہوتی ہے، ''وہ آدمی ہے رونا اس کو زیب نہیں دیتا، بڑے بچے روتے نہیں ہیں'' تو اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بچہ یہ بھی سیکھے کہ جذبات پر کیسے قابو پایا جاتا ہے، کیوں کہ جذبات تو بہر حال ہوتے ہیں ان سے انکار ممکن نہیں، ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ چھوٹی چھوٹی بات پر رونے سے گریز کرے اور زیادہ رونے والا نہ بنے، اپنی ہر بات منوانے کے لئے آنسوؤں کا سہارا نہ لے لیکن اس خواہش کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ بچہ اگر واقعی پریشان ہے، کسی تکلیف میں مبتلا ہے تو والدین بغیر کسی احساس شرمندگی کے اسے اظہار جذبات کا موقع دیں۔

متوازن صحت وشخصیت کے پروان چڑھنے کے لئے ضروری عناصر میں ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ بچہ موقع ومحل کے مطابق ہنسنے اور رونے کی قدرت رکھتا ہو، اس کے برخلاف اگر اس کو اس پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کو دبائے اور ہر بات پر نہ روئے تو اس سے متوازن صحت اور متوازن شخصیت کی نشو ونما ممکن نہیں۔

چھوٹے بچوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں احساسات وجذبات بہت کم وقفہ میں مسلسل تبدیل ہوتے رہتے ہیں، ایک لمحہ میں بچہ ہنستا ہے اور خوشی کا اظہار کرتا ہے پھر یکا یک رونا شروع کر دیتا ہے اور کسی تکلیف و پریشانی کے احساس کا مظاہرہ کرتا ہے، چشم زدن میں تھکن ظاہر کرتا ہے اور دوسرے ہی لمحہ پھر نشاط دکھاتا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ ابھی بچہ میں بڑوں کی طرح نہ یہ قدرت ہے اور نہ ہی اس نے سیکھا ہے کہ وہ اپنے احساسات کو دبا سکے اور جذبات پر قابو پا سکے اس لیے وہ جیسے ہی کوئی چیز اپنی مرضی کے موافق پاتا ہے فوراً ہنس پڑتا ہے خوشی کا اظہار کرتا ہے اور ذرا جو ٹھیس لگے تو بس آنسوؤں کی جھڑی بندھ جاتی ہے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بچہ کا احساس اپنی جگہ مسلم ہوتا ہے، اس کا جذبہ اپنی جگہ صادق ہوتا ہے، چاہے بڑوں کے نزدیک وہ قابل توجہ اور لائق اعتناء نہ ہو اور وہ اسے یہ تلقین کریں کہ ''یہ بات رونے کی نہیں ہے'' کبھی کسی بات سے بچہ کا دل ٹوٹتا ہے، کبھی اس کو اپنی خوشی کا فور ہوتی نظر آتی ہے اس صورت میں اس کا تھوڑا رو لینا ہی بہتر ہے چہ جائیکہ اس کو نہ رونے کی تلقین کی جائے، کہ اس رونے سے اس کے جذبات کی تسکین ہو جائے گی، کیوں کہ بچپن میں رونا تسکین قلب اور جذبات کو سمجھانے اور قابو پانے کا بہترین ذریعہ ہے، بلکہ بڑوں کی بابت بھی یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ جو لوگ کسی حادثہ کے بعد رو لیتے ہیں ان پر اس کے اثرات اتنے نہیں پڑتے جتنے ایسے لوگوں پر پڑتے ہیں جو شدت جذبات کو چھپانے کے لئے اس طرح کوشش کرتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں، جذبات سے مغلوب ہو کر رونے میں بڑے چھوٹے، مرد، عورت، بچے اور بچیاں سب برابر ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کو اس کا موقع دیا جائے، بلکہ ایسے مواقع پر والدین انہیں چمٹائیں، تھپکیاں دیں اور دلاسے دینے کی کوشش کریں، البتہ یہ بھی ملحوظ رہے کہ بچہ پر یہ بات بہت جلد واضح ہو جاتی ہے کہ وہ آنسوؤں کا سہارا لیکر اپنی بات منوا سکتا ہے اور اپنے مطالبات پورے کرا سکتا ہے، خواہ وہ مادی مطالبات ہوں یا ماں باپ کی توجہ حاصل کرنے، ان کے ساتھ ہنسنے کھیلنے جیسے معنوی مطالبات۔

اب ظاہر ہے کہ والدین اپنے بچے کے متعلق زیادہ بہتر جانتے ہیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ بچے کے آنسو بناوٹی کب ہوتے ہیں اور کب وہ واقعی کسی پریشانی اور کسی ناپسندیدہ واقعہ کے پیش آنے سے روتا ہے، چنانچہ جب بچہ بناوٹی آنسو گرائے تو اسمیں کوئی حرج نہیں کہ اس کے اس فعل کی شناعت اس پر واضح کی جائے اور اس کو بتایا جائے کہ اپنے مطالبات منوانے کا یہ طریقہ بالکل صحیح اور پسندیدہ نہیں بلکہ اس کو فوراً دوسرے طریقے سکھائے جائیں اور اسے یہ باور کرایا جائے کہ بناوٹی آنسوؤں سے وہ اپنا کوئی مقصد حاصل نہیں کر سکتا، اس کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ بچہ رونے کے ذریعہ والدین پر پریشر بنانا نہ سیکھ پائے ورنہ اسی عادت کے ذریعہ وہ دوسروں پر بھی پریشر بنانے کی کوشش کرے گا، پھر اسی طرح رو کر اپنی

کمزوری و عاجزی ظاہر کرنے کی اس کی عادت پڑ جائے گی اور آئندہ زندگی میں وہ ہر کسی کی توجہ اور شفقت حاصل کرنے کے لئے یہی حربہ استعمال کرے گا خواہ بیوی سے معاملہ ہو یا رفیق کار سے یا کسی اور دوست وغیرہ سے، لیکن اس وقت اس کے آنسوؤں سے متاثر کرنے کی عمر نکل چکی ہوگی بلکہ عمر کے اس مرحلہ میں اس کی یہ عادت لوگوں میں اس کے تئیں نفرت پیدا کرے گی، وہ بچشم خود دیکھے گا کہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے اور اس کے تعاون کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے، اس لیے بچپن میں والدین کا بچے کے رونے سے پریشر میں آنے سے بچنا انتہائی ضروری ہے، ایسے موقع پر اس کو سمجھانا چاہیے کہ ''وہ ابھی چھوٹا ہے سمجھتا نہیں'' ۔۔۔ وغیرہ اور اس طرح اس میں اپنی ذات پر اعتماد پیدا کرنا چاہیے، بصورت دیگر والدین بچے کے آنسوؤں سے متأثر ہوکر اگر اس کا ہر مطالبہ پورا کریں گے تو غیر شعوری طور پر وہ اس میں عجز و کمزوری کا احساس پیدا کردیں گے جس سے ہمیشہ وہ دوسروں کی امید پر جیے گا اور کام میں دوسروں کے سہارے رہے گا، والدین کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ بچہ میں عجز کے بجائے قدرت کا احساس پیدا کریں، اسے توکل کے بجائے عمل کی تعلیم دیں چنانچہ جب کبھی ایسا ہو کہ بچہ کسی وجہ سے ناراض ہوکر یا بد دل ہوکر روئے اور اسے اپنا دل ٹوٹنے کا احساس ہوا ہو، تو اس کے کچھ دیر بعد ہی نہایت عقلمندی سے اس کو کسی ایسے کام پر آمادہ کرنا چاہیے جو کام اس کے موافق بھی ہو اور اس کے کرنے پر اسے قدرت بھی، تاکہ اس میں وہ خصوصیات پیدا ہوسکیں جو آئندہ زندگی میں اسے کامیاب انسان بنائیں گی۔

بچہ کو یہ سکھانا بہت ضروری ہے کہ زندگی میں غم و تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا، کبھی مقاصد کی برآوری نہیں ہوگی لیکن ان سب حالات کے ساتھ جینے کا نام ہی زندگی ہے، لہذا کبھی تو بچہ کو رونے کا موقع دیا جائے، کبھی اس کی ہمت افزائی کی جائے اور ساتھ ہی اس کو روکر ہمیشہ اپنی کمزوری ظاہر کرکے مقصد پورا کرنے کا عادی بننے سے بھی بچایا جائے۔

جب کبھی بچہ کی کوئی بات نہ پوری ہو پھر اس کی تھوڑی سی دلجوئی کردی جائے اور سمجھا دیا جائے تو جلد ہی اس کو یہ بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ زندگی چلتی رہتی ہے اور انسان کو زندگی کی مختلف کیفیتوں اور مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اکثر بچے اس نکتہ کو بہت جلد سمجھ لیتے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچے ہمیشہ اپنے حال میں مست رہنا پسند کرتے ہیں نہ انہیں گذرے ہوئے لمحات کا خیال ہوتا اور نہ مستقبل کا فکر اور نہ ہی تاریخ کی الجھنوں سے کوئی مطلب، بچے کو تکلیف اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کی جب تعلیم دی جائے گی تو یہ فطری بات ہے کہ کبھی وہ روئے گا، کبھی اس کو پریشانی ہوگی اور کبھی غمگین ہوگا، اس کے ان جذبات کی قدر کرتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کرنا اور سمجھا بجھا کر اس حال سے نکال لینا اور پھر زندگی ادھارے میں لے آنا ہی دانشمندی ہے۔

احساسات کے سلسلہ میں آخری بات: جس کے ایک سے زائد بچے ہوں اسے سارے بچوں کے یکساں احساس کی توقع کرنا فضول ہے، اس لیے کہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، انسانی مزاج میں تنوع پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ شور وشغب کا عادی ہوتا ہے تو دوسرا خاموشی پسند، کوئی چیز ایک کے لیے پریشان کن ہے تو وہی دوسرے کو بالکل پریشان نہیں کرتی، بعض بچے دوسروں کے مقابلہ میں کسی بات کو بہت گہرائی سے سوچتے ہیں، ان کا احساس بہت بڑھا ہوتا ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ بچہ کا مزاج اور اس کے احساسات اس کے اختیاری نہیں ہوتے، اس لیے یہ توقع کرنا صحیح نہیں ہے کہ ہر بچہ دوسرے کے مثل ہو، والدین کے لئے ضروری ہے کہ بچے کے ساتھ صبر کا مظاہرہ کرتے رہیں، اسے دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اس کو احساس دلائیں کہ کیا چیز اس کے لیے پریشان کن ہے اور کیا چیز اس کو ناراض کرتی ہے، اس کے بھڑکنے کا سبب بنتی ہے، اسی طرح اس کی ضروریات کا اسے احساس دلائیں البتہ اس پر بھی توجہ رہے کہ وہ اپنے ان خیالات واحساسات کو سمجھے اور ان کو برتے۔

ایک نکتہ یہ بھی سمجھنے کا ہے کہ ایک ہی بچہ کے جذبات و احساسات دن رات کے مختلف اوقات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ دن کے آخری حصہ میں جب وہ تھکا ہوا ہوتا ہے تو زیادہ پریشان ہوتا ہے، اس کے برخلاف بہت سے بچے جب صبح کو سوکر اٹھتے ہیں تو روتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں، کچھ بچے کھانے کے وقت بڑی بدمزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ بچوں میں اس طرح کی تبدیلیاں بے سبب نہیں ہوتیں، اس میں بڑا سبب صبح وشام اور کھانے سے قبل بلڈ شوگر کے توازن کا بھی ہوتا ہے، اس کے علاوہ بچہ کا دن بھر کا نظام اور طریقۂ زندگی اس تبدیلی کا ایک مؤثر عامل ہوسکتا ہے، اس کو بالکل یوں سمجھنا چاہیے کہ ہم اپنی ۲۴ گھنٹے کی زندگی میں خود مختلف کیفیات کا شکار ہوتے ہیں، کسی وقت زندگی اور نشاط کا احساس ہوتا ہے اور کسی وقت تھکن سے دو چار ہوتے ہیں، کسی وقت کام کی طاقت ہوتی ہے اور کسی وقت آرام کو دل چاہتا ہے، یومیہ زندگی میں واقع ہونے والی یہ تبدیلیاں بچوں میں وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ آتی ہیں، والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے مزاج سے واقف ہوکر مناسب طریقہ سے ان کے ساتھ معاملہ کریں۔

انہیں خود بھی اس کا اندازہ رکھنا چاہیے کہ کس وقت انہیں بچوں کے ساتھ پریشانی ہوتی ہے اور کس وقت ان کے ساتھ رہنے پر خوشی ہوتی ہے، اگر اس کا اندازہ نہ کیا گیا تو پھر بڑے خود اپنے مزاج کی پریشانی سے بچوں کی پریشانی میں اضافہ کریں گے، یہ بھی ضروری ہے کہ بچوں کے ساتھ ان کی دلچسپی کے لئے اپنا وقت فارغ کیا جائے اور ان کی دل بستگی کی جائے، اگر بچے ایسے اوقات میں اپنے ساتھ کھیل کود کے لئے تنگ کریں جو خود ماں باپ کی تھکن یا پریشانی کا ہو تو بچے کو پیار سے اس کا احساس دلا دیا جائے کہ بیٹا اس وقت ذرا سا آپ خاموش رہیں ہم پھر آپ کے ساتھ تھوڑی دیر بعد کھیلیں گے یا آپ کا یہ کام کریں گے وغیرہ۔۔۔۔

☆☆☆

دردِدل

ہماری اخلاقی پستی، مظلومیت اور ذلت کا اصل سبب

خواص امت کی خدمت میں ایک خادمانہ عرض داشت

از: یحییٰ نعمانی

مسلمانوں کی گزشتہ دوصدیوں کی تاریخ ذلتوں، نکبتوں اور المناک مظالم سے بھری ہوئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے حصے میں بھی اس خونچکاں تاریخ کے زخم آئے ہیں، بے چارگی کا حال یہ ہے کہ بقول شاعر گویا ان کی قسمت ہی یہ ہو کہ:

جگر پر زخم لیں گے، زخم پر مرہم نہیں لیں گے

ایک زخم پر مرہم نہیں رکھا جاتا کہ دوسرا زخم لگا دیا جاتا ہے، ان کی کمزوری اور ذلت و بے چارگی روز افزوں ہے، وہ صرف دوسروں کے رحم وکرم پر ہیں، اور کوئی راہ حالات کے بہتر ہونے کی نظر نہیں آتی۔ مسلمان اپنی مظلومیت پر ماتم کرتے ہیں۔ اس سے فارغ ہوتے ہیں تو احتجاج کر لیتے ہیں، دیوانے چیخ لیتے ہیں، فرزانے فلسفیانہ غور وفکر میں مشغول ہوکر دل بہلا لیتے ہیں۔ اس سے مایوس ہوتے ہیں تو قیادت نہ ہونے کا شکوہ کر لیتے ہیں یا دشمنوں پر تبرا پڑھ لیتے ہیں؛ مگر حق یہ ہے کہ حالات کے بدلنے کی کوئی راست تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

کوششیں سب دم توڑ گئیں، اور امیدوں نے اندھیروں کی چادر اوڑھ لی۔ اس محیط مایوسی اور ہمہ جہت ناکامی کا ایک بنیادی سبب ہماری شدید پست اخلاقی حالت جو بڑی سے بڑی قوم کو کسی کا کام نہیں چھوڑتی، جس نے ہر کام بگاڑ دیا ہے اور ہر کوشش ناکام کر دی ہے۔

حالات کے بھنور میں پھنسی کسی قوم کو کنارے لگانا، اس طبقے کا کام ہوتا ہے جو عقل وخرد اور سماجی مرتبے میں ''خواص'' کے درجے کا ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں یہی طبقہ قیادت کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس ذہانت وفراست، ہمت و حوصلہ، ایثار و بے لوثی، حقیقت پسندی اور غیرت مندی کی صفات سے متصف خواص کی ایک جماعت ہوتی ہے تو وہ پوری قوم میں عزم، جوشِ عمل، صبر و برداشت، حالات کی تبدیلی کے لئے قربانیوں کا مزاج اور ظلم سے نبرد آزمائی کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے وہ کمزور قوم گوہرِ کردار سے مزین اور قوت عزم سے مسلح ہوکر حالات کے گرداب سے ابھر آتی ہے۔ اور پھر اس کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، جس میں وہ ثابت کر دیتی ہے کہ انصاف اور طاقت کے سلسلے میں قلت و کثرت بے معنی اور غیر مؤثر باتیں ہیں؛ مگر جب طبقۂ خواص میں کردار کی بنیادوں میں پانی مرنے لگتا ہے اور اخلاق کے شجرِ پُر بہار کی جڑیں دیمک زدہ ہوجاتی ہیں تو اس

قوم کو حالات کی ستم ظریفیوں سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ قرآن نے بھی یہی قاعدہ بیان کیا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بھی اسی اصول کی تفسیر ہے۔

اب ذرا غور کیجئے! ہماری قوم میں آپ جن افراد اور گروہوں کو اس ''خواص'' کے طبقے میں شامل کر سکتے ہیں، ذرا ان کی اپنے ذہن میں نشان دہی کر لیجئے۔ آپ کے ذہن میں جو تصویریں اور کردار ابھریں ان کو پہچان لیجئے، سوچ لیجئے یہ کون لوگ ہیں۔ اور خدا کے واسطے سے یہ حقیر خادم التجا کرتا ہے کہ اگر آپ کو اس میں کہیں اپنی ذات بھی نظر آئے تو اس کو بھی نظر انداز نہ فرمایئے۔ ان میں ہماری قوم کے تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات آتے ہیں، ان میں علماء بھی آئیں گے، بڑے تاجر بھی آئیں گے، قومی تنظیموں کے لوگ بھی شامل ہوں گے اور ملی قومی اداروں کے ذمے دار بھی۔ میڈیا اور صحافت سے وابستہ حضرات اور سیاسی میدان میں مختلف سطحوں پر سرگرم افراد اور وہ تمام لوگ اس دائرے میں آتے ہیں جو مسلمانوں کی اجتماعیت میں کسی بھی نمائندگی یا قیادت کی پوزیشن میں سمجھے جاتے ہیں، یہ سب لوگ مسلمانوں کے خواص ہیں اور ملت کے اچھے برے کے ذمے دار بھی۔

ذرا سوچیں اور ذرا حقیقت پسندی؛ بلکہ بے باکی کے ساتھ سوچیں! ہمارے اس سربرآوردہ طبقے کا اخلاقی کردار کس سطح کا ہے؟ اس میں کس قدر خلوص، بے لوثی اور ایثار کی صفت ہے؟ اپنی مظلوم فریادی قوم کے لیے ان کی دردمندی کا کیا حال ہے؟ کیا یہ خودداری، غیرت مندی اور بے نیازی کی شان رکھتے ہیں؟ ان میں کتنی بلند حوصلگی اور عالی ہمتی ہے؟ کیا سیم و زر ان کے پائے استغناء کے بوسے لیتے نظر آتے ہیں؟ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر کیا شہرت اور منصب ان کی اصول پسندی اور رفعتِ کردار کو متأثر کرنے میں ناکام رہتے ہیں؟ اور اگر قومی مصلحت ان کے ذاتی مفادات اور امنگوں کی قربانی مانگے تو یہ اس امتحان میں کتنے کامیاب ہو سکتے ہیں؟ خواص کی اخلاقی حالت جاننے کی کسوٹی اسی قسم کے سوالات ہیں۔

یقیناً آپ کے ذہن میں ان سوالوں کے جو جواب آئے ہوں گے وہ مایوس کن ہوں گے، اگر آپ اپنی قوم کو مظلوم اور کمزور جانتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کی طاقتیں اس کے خلاف سازشوں اور ستم رانیوں میں مصروف ہیں تو یقیناً آپ کو اس کا بھی یقین ہوگا کہ ان مصائب سے نجات پانے کے لئے آپ کی قوم کو سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اتحاد اور باہمی تعاون و مدد کا مزاج ہے؛ مگر جان لیجیے کہ ہمارا جو اخلاقی حال ہے، اس سے سب سے پہلے قوم کا اتحاد پارہ پارہوتا ہے؛ اس لیے کہ اتحاد کی پہلی شرط ایمان دارانہ حق شناسی، دوسروں کی برتری کا شریفانہ اعتراف اور ایثار جیسی صفات ہیں۔ اگر خواص میں حق شناسی نہ ہو، ایمانداری کے ساتھ دوسروں کے مرتبے اور فوقیت کا اعتراف نہ ہو، اور کم از کم درجے کا بھی ایثار نہ ہو، اور ان صفات کی جگہ عالم یہ ہو کہ ہر شخص اپنی ذات کا اسیر اور خود کی عبادت میں مصروف ہو تو یقیناً نفسی نفسی کا عالم ہی قائم نظر آئے گا۔ آج جو انتشار مسلمانوں کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے وہ اخلاق کی اسی بیماری کی دین ہے۔ اس بیماری کی شدت کے باوجود اپنی صفوں میں اتحاد کی توقع کرنا ایسا ہی ہے کہ آپ کسی بیمار و لاغر سے توقع کریں کہ وہ کسی بڑے پہلوان کو چت کر دے۔

اتحاد کے بعد دوسری چیز جو خواص کی اخلاقی پستی سے ریزہ

ریزہ ہوتی ہے، وہ ہے قوم کا اپنی قیادت پر اعتماد۔ قیادت پر سے اعتماد اٹھنے کے بعد عوام مایوس اور بے عزم ہو جاتے ہیں اور کسی جدو جہد اور تحریک میں سرگرم نہیں ہوتے۔ جب ان کو کسی قربانی کے لیے پکارا جاتا ہے تو وہ دعوت صدا بہ صحرا ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ کوئی رہنمائی قبول نہیں کرتے۔ ان کے لیے اپنے پرائے اور ناصح و بدخواہ برابر ہو جاتے ہیں اور وہ ہزار آگاہیوں کے باوجود کسی دشمن اور بدخواہ سے پرہیز نہیں کرتے۔ آپ کو قوم کے ساتھ نہ دینے کا شکوہ ہے، بجا ہے؛ مگر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ خواص کے موجودہ حال کے ہوتے ہوئے عوام اعتبار و اعتماد کا حوصلہ کہاں سے لائیں۔ ہم مسلمانوں کی بے عملی کا شکوہ کرتے ہیں، کیا اس کے اس بنیادی سبب پر بھی غور کرتے ہیں جس نے ان سے ان کی امیدیں چھین لی ہیں؟؟

اسی کے ساتھ تیسرا سانحہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے اور بیگانوں دونوں کی نگاہ میں قیادت کا وقار اور بھرم جاتا رہتا ہے۔ انہیں باتوں کا نتیجہ ہے کہ اکثر ہماری ملی قیادت حکمرانوں اور ذلیل قسم کے سیاست دانوں اور حقیر افسران کا کھلونا بن جاتی ہے، جو ہمیں جہاں چاہتا ہے استعمال کرتا ہے اور جس کام میں چاہتا ہے لگا دیتا ہے۔

قومی اصلاح و ترقی کا یہ اصول ہے کہ نچلی سطح کے عوام اپنے سربرآوردہ طبقات کے تابع ہوتے ہیں۔ خواص اگر اصول پسندی، بے غرضی، ایثار، سچائی، اعتراف حق گوئی، انصاف اور مقصدیت کی صفات کا مظاہرہ کریں گے تو یقیناً ان کے کردار کے اثرات پوری قوم پر پڑیں گے۔ اور اگر عوام کو یہ نظر آئے گا کہ چہار طرف حقیر ذاتی اغراض کا بول بالا ہے، ان کا اکثر تجربہ یہ ہو کہ جس خوش نما ظاہر کی چادر کو اٹھایا جائے اندر سے مال طلبی اور شہرت طلبی کی بھدی رنگت ہی نظر آتی ہے تو پھر ان کے عقل و شعور اسی کے عادی ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا میں یہی جینے کا طریقہ ہے۔ اس صورت حال کا جو سب سے مضر بلکہ مہلک پہلو ہے، وہ یہ کہ قوم کے جو باشعور دردمند اس پست اخلاقی سطح سے بلند بھی ہوتے ہیں، ماحول کی مایوسیاں ان کے حوصلوں کی لگام کھینچ لیتی ہیں اور وہ کسی خاموشی کے غار میں بیٹھ رہنے میں ہی عافیت اور اپنے دین و دل کی خیر اور عزت و آبرو کی سلامتی سمجھتے ہیں۔

عوام کی سطح کے لوگوں کو تو جانے دیجیے، خواص اور قیادت کے درجے پر فائز طبقے کی افسوسناک اخلاقی صورت حال سب کے سامنے ہے۔ یقیناً ان میں بعض اپنی ذاتی خصوصیات میں نہایت لائق ستائش اور قابلِ تحسین کردار کے حامل ہیں۔ ان میں اہلِ تقویٰ علماء بھی ہیں، زاہدانِ شب زندہ دار بھی ہیں، شریف الطبع قائدین بھی ہیں اور عالی دماغ دانشوران بھی؛ مگر جسے آپ اجتماعی اخلاق کہتے ہیں، اس میں خواص کہلانے والوں کا حال بھی معیاری نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اصول پسندی کی جگہ ہماری قیادتوں کا شیوہ مطلب پرستی اور اغراض کی رعایت ہو چکا ہے۔ جس کو جس موقف اور کام میں فائدہ نظر آتا ہے وہ اس کی بھرپور وکالت کمالِ دلسوزی اور خلوص کے مظاہرے کے ساتھ کرتا ہے۔ یقین کیجیے راقمِ سطور کا مقصود نہ کوئی شخص ہے، نہ کوئی جماعت و طبقہ اس عاجز نے انگشت نمائی کے شبہے سے بچنے کے لیے اجمال ہی کو بہتر جانا ہے اور مفید مطلب ہونے اور اس عرض داشت کی تاثیر و افادیت میں اضافے کی توقع کے باوجود کچھ صاف مثالیں دینے سے عمداً پرہیز کیا ہے۔

نوعمری میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے ایک بات بار بار سنی تھی، فرماتے تھے: ہماری قوم سے اجتماعی کاموں کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے''۔اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ اجتماعی کام اجتماعی اخلاقیات سے ہوا کرتے ہیں، اور یہاں اجتماعی اخلاقیات تو کیا ذاتی اور انفرادی شریفانہ صفات بھی کم لوگوں کے یہاں ملتی ہیں۔ یہی بات بعد میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حوالے سے سنی۔ ملت کے دو حکیم جب ایک ہی نتیجے پر پہنچیں تو کیا شبہہ یہی اصل مرض ہے باقی سب نتائج ومظاہر ہیں۔

یہ حقیر اولاً تو کسی شمار وقطار میں نہیں، پھر کردار کا وہ خود مفلس ہے۔اس کا بند قبا ایسا تار تار ہے کہ پاکیِ داماں کی حکایت کا کیا سوال؟ مقصد نہ کسی کی تخفیف، نہ کسی حلقے کی طرف انگشت نمائی۔ جو کچھ مقصد ہے وہ یہ کہ اپنے اس سب سے اہم مسئلے پر کچھ سوچ بچار کیا جائے کہ یہ مظلومیت اور ذلت ونکبت کی کالی گھٹا کیوں نہیں چھٹ رہی؟ ہم سرزمینِ ہند کی سب سے با عزت قوم کے مقام سے گر کر سب سے حقیر، سب سے کمزور، اور سب سے ذلیل کیوں ہوگئے؟ اس ملک میں اگر کوئی جنگلی بلا مار دے تو اس کے لیے سزا ہے؛ مگر کوئی مسلمان کا خون بہائے تو وہ لیڈر بن جاتا ہے۔ سب قوموں پر برے دن آئے اور رخصت ہوگئے؛ مگر ہماری پستی عروج آشنا ہونے کا نام کیوں نہیں لے رہی؟ نکبت و ذلت کے اس اندھے غار سے باہر آنے کی ہماری کوشش کامیاب کیوں نہیں ہو رہی؟

بے اصولیوں کی مثالیں ہمارے اطراف میں اس قدر بھری پڑی ہیں کہ کسی نشاندہی کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں نے جو تعلیمی ادارے کاروباری مقصد اور ذاتی مالی فائدوں کے لیے قائم کیے ہیں وہ تو مارکیٹ کے معیار کے ہیں؛ مگر دوسری طرف ذرا سوچیے، مسلمانوں کے پاس اس ملک میں کتنے ایسے تعلیمی ادارے ہیں جو قومی ترقی اور رفاہ وفلاح کے مقاصد کی خاطر قائم کیے گئے تھے، ان کا تعلیمی اور انتظامی حال دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔

اعلیٰ درجے کے خواص کے اندر تنگ نظری کا جب یہ حال ہو کہ ایک کام اگر ان کی قیادت وسربراہی میں انجام پائے تو اس کی ضرورت ایسی کہ ملت کی بقا اسی پر منحصر بتلائیں، ہمہ وقت اسی کی اہمیت پر زور دیں اور تمام خلق کو اس میں مشغول ہونے کی دعوت۔ پھر اگر اس کی سربراہی کسی اور کو منتقل ہوجائے تو اب اس کا تذکرہ ہی نہیں، نہ کسی کو اس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ یہ تنگ نظری ہی نہیں بے مقصدیت بھی ہے۔

شہرت طلبی نے ہمارے ہر کام کو محض نمائشی بنا دیا ہے۔ ہر ایک کو بس اس کی فکر ہے کہ اس کی اور اس کے کام کی کتنی تحسین ہو رہی ہے۔ اپنی خبریں چھپوانے کے لیے اخبارات کو اشتہارات سے نوازا جاتا ہے۔ کام کو اشتہار کی ضرورت ہو تو وہ بجا؛ مگر یہاں اشتہار کام کی ضرورت کے لیے نہیں بلکہ کام اشتہار کی ضرورت کے لیے ہوگیا ہے۔ پستیوں نے تھاہ چھو لی ہے، ہمارا کوئی عزیز وہ ڈگری اگر لے لے جو ہندوستان کے ہزاروں لوگ لیتے رہتے ہیں تو ہم اخبار میں اشتہار دے دے کے اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ عوام ایسی سستی حرکتیں کریں تو کم افسوس کیا جائے؛ مگر جب خواص اس پست درجے پر آجائیں تو یہ کسی قوم کی بربادی کی حتمی نشانی ہے۔

خود غرضی اور مفاد طلبی نے ہر اندازے سے تجاوز کر لیا ہے۔ ہماری اس کمزور، بلکہ ذلیل کیفیت کو وقت کے تمام حکمرانوں نے

خوب سمجھ لیا ہے۔ ہمارے ایک بزرگ برطانیہ میں تعینات ہندوستانی سفیر سے مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں بات کرنے گئے۔ بعض مسائل پر ان کو توجہ دلانے کے بعد جب گفتگو اختتام کو پہنچی سفیر صاحب نے سوال کیا اور کچھ؟ جواب نفی میں دیا گیا تو سفیر صاحب نے زیادہ صراحت سے پوچھا اپنی کوئی ضرورت بتلائیں، ان بزرگ نے فرمایا: نہیں! یہ بات ان سفیر صاحب کے لیے کافی تعجب کی تھی۔ کہنے لگے آپ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی کوئی ضرورت نہیں بتلائی، ورنہ مسائل تو عنوان ہوتے ہیں، اصل بات تو کچھ ذاتی ہی ہوتی ہے؟

یہ فسادِ نیت اور پستیِ کردار ہم سے ہر نا کردنی کرا سکتی ہے۔ ہم مسلمانوں کے قاتلوں سے بغل گیر ہو سکتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے خلاف ہر سازش کی حمایت بھی کر سکتے ہیں۔ کسی خاص سازشی اقدام کا نام کیا لیا جائے؟ جب کوئی حکومت کوئی ایسا قدم اٹھاتی ہے جس سے مسلمانوں کو اور ان کے دینی و ملی کردار کو نقصان پہونچانا مقصود ہوتا ہے تو ہمارے خواص کے طبقے سے اس کی پوری وکالت بھی کروانے میں وہ کامیاب ہوجاتی ہے۔ افسوس! اچھے اچھے لوگ اپنے مفادات و مصالح کی خاطر حکومتوں کے ایسے اقدامات کی تائید؛ بلکہ ان کا حصہ بننے پر راضی ہوجاتے ہیں، جن کے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر ہونے میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ مال وجاہ کے سامنے نہ قائدین کو اپنی حیثیت عرفی کی پروا رہتی ہے، نہ علماء کو جبہ ودستار کی عظمت کا خیال اور نہ اللہ کے سامنے اس منافقانہ عمل کی باز پرس کا خوف۔

آپسی تنافس نے بھی ہمیں نہایت نقصان پہونچایا ہے۔ مجھے صاف عرض کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ اگر ہماری ہر تنظیم مسلمانوں کے مسائل کے بجائے اپنی نمائندگی اور حلقۂ اثر بڑھانے ہی کو عملا اصل مقصد اور اولین ترجیح بنائے گی تو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا یہ لامتناہی شوق ہرنا کردنی کرانے کے لیے کافی ہے۔ اور پھر جب مات کر دینے کا کھیل شروع ہوجائے تو اخلاق واصول کہاں بچتے ہیں؟ افسوس جو تنظیمیں اور ادارے مسلمانوں کے مسائل کے حل اور دین کی خدمت کے مقصد سے قائم ہوتے ہیں، دھیرے دھیرے تنافس اور دیکھا دیکھی کام کی نذر ہوجاتے ہیں۔ پھر انہیں ہر حکومت، ہر پارٹی اور ہر ایجنسی ہر طرح استعمال کرتی ہے۔

کسی مظلوم اور کمزور قوم کی قیادت کو اگر ذلت کے گرداب اور ظلم کے شکنجے سے خلاصی حاصل کرنی ہے اور طاقتور حکومتوں سے پنجہ آزمائی کرنی ہے تو اس کے لیے غیرت وحمیت کی طاقت پہلی شرط ہے۔ آج آپ جس معرکے میں ہیں، اس میں طمع و لالچ کی عشوہ طرازیاں خوف کی لام بندیوں سے پہلے سامنے آتی ہیں۔ مگر ہم میں ''صاحب سلامت'' کا شوق اتنا پیدا ہوگیا ہے اور ہمیں سرکار دربار سے مرعوبیت نے اس بری طرح گھیرا ہے کہ اس کے ذکر سے بھی حیا مانع اور شرم دامن گیر ہے۔ افسوس وصد حیف! وہ امت جس کا اصول مال وزر اور حکومت وسلطنت سے بے پروائی تھا، اس کے خواص حقیر حکمرانوں، بلکہ افسران کی نظر عنایت کے لیے سراپا نیاز و مسکنت بنے ہوئے ہیں۔ ان کی مدح سرائی میں نہ صرف قلابے ملاتے ہیں؛ بلکہ ان کی رضا جوئی میں ہر رسوا کن قلابازی کھانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

ہوس کی دھوم دھام ہے نگر نگر، گلی گلی

قومی مقاصد، مال ومنال اور حقیر نوکریوں کی بھینٹ چڑھا دیے جاتے ہیں۔ اس حقیر نے اچھے اچھے قائدین اور سماجی کارکنوں کی سرکار دربار میں ایسی عاجزی اور بچھنے کی کیفیت کے متواتر قصے سن رکھے ہیں کہ شرمندگی سے سر جھکتا ہے۔ اب تو حال یہ ہے کہ حکمرانوں اور وزیروں کے کچھ گماشتے ہیں، جو جب ان کے آقا چاہتے ہیں وہ ان کے سامنے ہمارے رہنماؤں کی پریڈ کرادیتے ہیں اور جو چاہے بیان دلوادیتے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں میں مسلمانوں کے جو لوگ شریک ہوتے ہیں، ان میں سے ایک تعداد نہایت حقیر اور پست قسم کے افراد کی ہے، جن کے انداز نشست و برخاست سے صرف ذاتی اغراض کی طلب ظاہر ہوتی ہے۔ مزید برآں ان پارٹیوں کے ساتھ ہماری ملی قیادت کا رویہ بھی نہایت مایوس کن ہے۔ بعض جماعتوں کے بارے میں مسلم عوام کا یہ تأثر بڑھتا جارہا ہے کہ ان کے کردار کا ایک حصہ کسی سیاسی پارٹی کی حاشیہ برداری ہے۔ وہ ہزار صفائیاں دیں کہ سیاست کی وادی ان کی گزرگاہ نہیں؛ مگر عملا ان کے رہنما ہمیشہ اسی کوچہ کے طواف میں مشغول نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ تذکرہ نہ قوم کے رذیل و بدکردار لوگوں کا ہورہا ہے، نہ عوام کا۔ یہ ہمارے اچھے لوگ ہیں، یہ قوم کی قیادت اور نمائندگی کے مقامِ بلند پر سرفراز لوگ ہیں۔ ہم اہلِ مغرب کو اخلاقی پستیوں کا بڑا طعنہ دیتے ہیں، یقیناً ان کے ظلم سے انسانیت خوں چکاں ہے اور ان کی بے حیا تہذیب نے آدمیت کے شرف کو داغدار کیا ہے؛ مگر آپ مغرب کے کسی سیاسی یا قومی نمائندے سے اپنی قوم کے مفاد کی ایسی قربانی کی توقع نہیں کرسکتے جیسی ہمارے نمائندے معمولی سی پیشکشوں پر روز دیتے ہیں۔ کسی یہودی تنظیم یا قابلِ ذکر نمائندے نے آج تک ہولوکاسٹ کو معاف نہیں کیا۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں سکھوں کے ساتھ صرف ایک مرتبہ ۱۹۸۴ء کے فسادات کی شکل میں وہ پیش آیا جو ہمارے لیے روزمرہ کا قصہ ہے۔ کیا مجال کہ ان کا کوئی قومی نمائندہ اس کے حوالے سے کانگریس کی صفائی دینے کا ذلیل مظاہرہ کرے؛ مگر ہمارے نمائندوں کا کیا حال ہے، ہم جانتے ہیں۔ چھوٹے سے فائدوں کے لیے ذاتی عزائم اور مفادات کے لیے ہم ذلت انگیز حد تک پستی اختیار کرنے کو تیار ہیں۔ افسوس کہ محمد عربی ﷺ کی امت کو کوکافروں سے بھی عبرت نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر علماء کے طبقے کو ہر ایمانی کمزوری اور ہر اخلاقی فساد کا معالج بنایا ہے۔ علماء کی جماعت کا اصل فریضہ ہی دین و اخلاق کے اعلیٰ معیار کی حفاظت ہے۔ اہل بدعت اور گمراہ فرقوں کے علماء کہلانے والوں کا یہ ذکر نہیں، اہلِ حق میں شمار کیے جانے والوں میں سے ایک تعداد اسی پستی اور تنزل کا شکار ہے۔ ان سطروں کا لکھنے والا یہ حقیر و کمتر اور گوناگوں اخلاقی بیماریوں میں گرفتار کہاں سے علماء سے کہنے کا منہ لائے؟ علماء کے عزت و وقار میں کمی سے قوم کے دین کا بڑا نقصان ہے؛ اس لیے ڈر لگتا ہے کہ ان کو کچھ توجہ دلانے سے دوسری طرف کہیں دین کا یہ نقصان نہ ہوجائے۔ کیسے کچھ عرض کیا جائے، اور عرض کیے بغیر کیسے رہا جائے کہ حکیم ہی بیمار ہے اور افسوس کہ اپنی اس مہلک بیماری سے اکثر غافل ہیں۔

حیف کہ پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے ایک غیرت فروش مولوی کہلانے والا بی جے پی کی کور کمیٹی کا ممبر ہے اور وہ ایک مدرسے میں جاتا ہے۔ مدرسے کے ذمے

دارون کا حال دیکھیے کہ اس شخص کو عین مدرسے کے اندر پریس کے نمائندوں سے مخاطب ہونے کا موقع دیا جاتا ہے، وہ مدرسے میں بیٹھ کر بی جے پی کی وکالت کرتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ میں علماء کو بی جے پی میں شامل کرانا چاہتا ہوں۔ سوچیے مدرسے کا ذمے دار ہوتے ہوئے کوئی اس نفاق اور ملت فروشی کا معاون بھی بن سکتا ہے! اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ایک مدرسے کے ذمہ دار نے اپنی غیرت کو سرِ بازار اس طرح سولی دی کہ انتخابات میں ایک فلمی اداکارہ کے ساتھ خوب گھومے۔ اور اپنے دین کی قیمت یہ وصول کی کہ مدرسے میں اس کے پارلیمانی فنڈ سے تعمیری کام کروائے۔ کیا اب ''علماء'' کا ان زنا کے داعیوں اور داعیات سے بھی جوڑ سکتا ہے؟ وہ صاحبہ پھر ان مولوی جی کے ہمراہ مدرسے میں قدم رنجہ بھی فرماتی ہیں اور مدرسے کی عمارت کا افتتاح بھی ان کے ''دستِ مبارک'' سے انجام پاتا ہے۔ اور ان سب نحوستوں اور ناپاکیوں کی باقاعدہ تصویریں محفوظ رکھی جاتی ہیں اور فخر وسرور کے ساتھ لوگوں کو دکھائی جاتی ہیں۔ آپ یہ سوچ کر دل کو مت بہلا لیجیے گا کہ یہ تو کوئی ایک آدھ فرد کا بگاڑ ہے، جی نہیں! وہ صاحب ان سب کارناموں کے بعد بھی آپ کی جماعت میں مطعون نہیں قرار پاتے، وہ حسبِ سابق قابلِ قبول ہیں۔ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے۔

ذاتی عمل اور کردار میں اس درجے گر جانے والوں کی تعداد تو کچھ خاص نہیں؛ مگر اس پر بڑوں کی طرف سے قول اور عمل سے شدید نکیر اور تقذر (گھن) کا اظہار نہ ہونے کی وجہ سے یہ پست اور فاسد عنصر اپنی تعداد لگاتار بڑھاتا جارہا ہے۔

اس سے اوپر بھی علماء کی ایک خاصی تعداد ہے جو الحمدللہ ایسی پست تو نہیں؛ مگر اپنے کردار اور گفتار سے عوام کے اندر کچھ اچھا تأثر نہیں چھوڑتی۔ ہمارے یہاں ہر طرف خاک اڑ رہی ہے۔ شہرت طلبی کی ایک ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر وقت اپنا اور اپنے چھوٹوں اور بڑوں کی ہی مدح وتوصیف وطیرہ بنا ہوا ہے۔ اللہ والوں کا حال تو یہ تھا کہ اپنے بڑوں کے تذکرے سے بھی اپنی تعریف کی بو آئے تو وہ اس سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے حضرت کا بھی تذکرہ نہیں کرتا کہ اس میں بھی میری تعریف ہے''۔

روزے نماز کی ظاہری دین داری کو اگر چھوڑ دیں تو ہم متاعِ دنیا کی تحقیر کے داعی ہوکر بھی کس قدر اسی کے پیچھے بھاگنے والے بنے ہوئے ہیں۔ وہی سود وسودا اور مکر وفن کی گرم بازاری، وہی مصنوعی گفتگوئیں۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ایک ذہین دردمند اپنے احساس کی اس گواہی کو چاہ کر بھی جھٹلا نہیں پاتا کہ ہماری تگ ودو کے عنوان کچھ اور ہوتے ہیں اور حقیقی مقاصد کچھ اور، کسی نام سے کانفرنس اور جلسہ ہوتا ہے اور اندر کی اصل نگاہ کسی اور چیز پر ٹکی ہوتی ہے۔

مدرسوں کے جلسوں میں سیاسی لیڈروں کا جو اکرام واعزاز ہونے لگا ہے کبھی ہم نے سوچا کہ اس کو دیکھ کر ہمارے چھوٹوں کے دل میں کیسی مرعوبیت پیدا ہوتی ہے؟ جب طلبہ اصحاب جبہ ودستار کو اہل دنیا کے سامنے بچھتے گرتے دیکھیں گے تو وہ کس کردار کے اٹھیں گے؟ ان کے خواب کیا ہوں گے؟ وہ اپنے لیے کس کردار کا انتخاب کریں گے؟ اور جب ان کے سامنے دین کے مفاد اور دنیا کی چمک دمک کا تصادم ہوگا تو وہ کیسے اپنے لیے استغناء اور غیرت وحمیت کی راہ چنیں گے؟ آہ! کہ

زہداور دنیا بیزاری جس کی پیشانی کا نور ہوا کرتے تھے، آج وہ وزیروں اور بادشاہوں کا دریوزہ گر ہے۔

اس متوسط طبقے سے بھی اوپر ہمارا ایک طبقہ اور ہے؛ قابلِ رشک حد تک با صفا، ذاتی دین داری سے مزین اور لائقِ تقلید پاکیزگی کا پابند؛ مگر وہ اونچا اخلاقی معیار اور با اصول کردار جو زمانے کے امام کا ہونا چاہیے، اور جس کے بغیر اس زبوں حال امت کا بھلا ہونے کی کوئی راہ زمانۂ حاضر میں نہیں، اس طبقے نے بھی اس منزل تک پہونچنے سے پہلے ہی اپنی ہمت کے پتوار رکھ دیے ہیں۔ جاہ و وقار میں منافست نے ہمیں اصحاب دنیا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ ایک صاحب کو اس پر افسوس کرتے پایا گیا کہ ان کے بین اقوامی سفر سال میں ایک آدھ ہی ہو پاتے ہیں اور فلاں صاحب کے کئی ایک۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس پست سوچ سے کیا کسی قوم کی کشتی بھنور سے نکل سکتی ہے۔ وہی گروہ بندیاں، وہی خلوص سے عاری مجاملت اور وہی مفادات و مراعات کے زیر اثر فیصلے جو اہل دنیا کے لیے بھی ذلت ہی ہیں، ہمارے گروہوں میں داخل ہوگئی ہیں۔ ایک بزرگ کا یہ جملہ کان میں پڑا تھا کہ آج کی دنیا میں کوئی یہ نہیں چاہتا کہ برائی نہ ہو، ہر ایک بس یہ چاہتا ہے کہ برائی اس کے جھنڈے تلے ہو' ہمارے دینی قائدین کے یہاں جب یہ منظر دِکھتا ہے کہ نہایت نامناسب؛ بلکہ منافقانہ کردار کے لوگ، جن سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچتا ہے، عزت و توقیر ہی نہیں تعاون اور مشارکت بھی پاتے ہیں تو الفاظ نہیں ملتے کہ کس قدر چھوٹوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ اب وہ کہاں سے یہ ہمت لائیں کہ معیار سے گری ہوئی حرکتوں سے ہر حال میں گریز کریں گے۔

اے کاش ہمارے یہ بزرگ سوچیں کہ ایسے دین دشمنوں اور ملت فروشوں کی جب ان کے رسوخ و طاقت کی وجہ سے یا کسی ایسی مصلحت کی بنیاد پر پذیرائی ہوتی ہے، جو بہر حال خالص دینی مصلحت نہیں ہوتی، تو ان کا یہ عمل عام دردمند مسلمانوں کے لیے کیسا مایوس کن اور ہمت شکن ہوتا ہے۔ مخلصانہ تنقید اور بے غرض روک ٹوک ایک قومی دینی ضرورت ہے جو موہوم وقتی مصالح کے لیے چھوڑ دی گئی ہے۔ ہم کو سوچنا چاہیے کہ رسول اللہؐ نے ''انکار مُنکَر'' یعنی خرابیوں پر ایک دوسرے کو متوجہ کرنے کی کس قدر تاکید فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ اس فریضے سے غفلت پر دنیا ہی میں اللہ کے عذاب کی وعید بھی سنائی ہے۔ اگر علماء اور وہ بھی بڑے علماء اپنی خوش نامی، تعلقات اور خوش رکھنے کے مقاصد سے اس فریضے کو چھوڑ دیں گے تو اخلاقی تنزل کے بھنور میں امت کی پھنسی کشتی نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔

یقیناً اللہ والوں کی ایک جماعت علماء میں ایسی ضرور ہے جو اخلاص و صدق، اور بے لوثی و پاکی میں نمونہ اور اسوہ کا درجہ رکھتی ہے؛ مگر عموماً ماحول ایسا ناسازگار ہے کہ وہ بس اپنے محدود دائروں کے اندر اپنے کردار کے دیے جلائے بیٹھے ہیں۔ ملی جدو جہد کے دائرے میں سود و سودا اور مکر و فن کی ایسی گرم بازاری ہے، اور دین و اخلاق کا ایسا نقصان نظر آتا ہے کہ

جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟

کا سوال سامنے آنے کے بعد ایسے اچھے لوگ اپنے بڑھے پاؤں بھی کھینچ لیتے ہیں۔ تنافس کے ماحول اور صدق و وفا کی

بہائے گراں مایہ کی شدید نا قدری کی وجہ سے ان لوگوں سے ہمارے اجتماعی معاملات میں قیادت اور رہنمائی کا جو فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا وہ نہیں اٹھایا جارہا۔

اے طبقۂ خواص! آپ ہی ملت کی آبرو ہیں، خطروں میں گھری اور اندیشوں سے گھبرائی اس ملت کو اللہ کے بعد آپ ہی کا سہارا ہے۔ ان سطروں کا لکھنے والا اس وقت شدید کرب والم سے دوچار ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں سوچتے وقت شرم و افسوس کے غم انگیز احساسات سے اس کی پیشانی عرق آلود ہے، مگر ''نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن'' کا معاملہ ہے۔ خموشی کی تاب ہے اور نہ کہتے بنے ہے۔ یہ اخلاقی زوال ہمارے جسمِ ملی کا زخم ہے۔.....اور اپنے زخموں کو کریدنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر.....مگر زخم کو صاف کیے بغیر جب تک آپ اوپر اوپر کی مرہم پٹی کیے جائیں گے اندر کی عفونت اور سڑاند بڑھتی ہی رہے گی۔

محترمانِ گرامی! مجھے خیال خاطر احباب چاہیے، اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ یہ لکھنے والا خود بھی ہزار خرابیوں اور گندگیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی ناپاکیوں پر مستزاد اس کی بے عملی ہے۔ یہ کردار کا غازی کیا ہوتا، اس سے تو گفتار بھی نہیں آتی؛ مگر جہاں تک اندازہ ہے ان سطروں کا مقصد اپنی براءت نہیں ہے؛ مگر دل کا اصلی حال اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

یہ حقیر آپ کو اللہ کا اور دین و رسول ﷺ کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہے، خدارا اپنے مقام اور ذمے داری پر غور کیجیے! رحم کیجیے اس قوم پر، آپ ہی اس کے دین اور دنیا کے امین ہیں۔ یہ قوم آپ کی ہی تو آس لگائے بیٹھی ہے۔ اور یہ بھی آپ اور آپ جیسوں ہی کا شرف اور مقام ہے کہ اس امت کے مسائل اور مشکلات اگر حل ہوں گے تو آپ ہی کی قیادت میں۔ اگر خواص میں کمزوریاں ہیں تو بھی امتِ مسلمہ ان سے دست بردار اور بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ اس کو آپ کی ضرورت ہے۔ کاش آپ کے سر پر آخرت میں رسول اللہ ﷺ کی امت کی کامیابی کا سہرا بندھے۔

آپ اگر اصول پسندی اور سچائی اور ایثار کو نہیں اختیار کریں گے تو آپ جانتے ہیں کہ حالات ملک میں مسلمانوں کے لیے کس قسم کے اندیشوں کی آگاہی دے رہے ہیں۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ آپ اپنے کسی ذاتی یا اپنے گروہ کے کسی فائدے کے لیے جو قدم اٹھا لیتے ہیں وہ سبب بنے گا مسلمانوں کی تباہی کا اور اللہ کے یہاں آپ کے حساب میں لکھا جائے گا کہ یہ بندہ مسلمانوں کے خون بہنے کا، بلکہ اس ملک میں اسلام کی شکست کا ذریعہ بنا۔ خدا نہ کرے ہم آپ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ایسے کسی جرم کے مجرم بنا کر حاضر کیے جائیں۔

یہ آپ کے ایک بھائی کی ایک خادمانہ عرض داشت ہے۔ ایک مدت سے اس کے دل میں آپ سے کچھ عرض کرنے کی تمنا تھی، مگر انتظار تھا کہ یہ کام کسی موقر بزرگ کی طرف سے انجام پائے، مگر پھر خیال ہوا کہ شاید جو پہلو اس عاجز کے ذہن میں ہیں، شاید دوسروں کے ذہن میں نہ آسکیں۔ اللہ کے واسطے سنجیدگی سے مسئلے پر غور فرمائیں۔ اگر اپنے کسی موقف میں تبدیلی کی ضرورت محسوس فرمائیں تو آخرت میں اللہ کے عظیم اجر اور دنیا میں اس کی غیبی مدد و نصرت کی توقع کے ساتھ اس تبدیلی کو کر گزریں! اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو!

☆☆☆

نقطۂ نظر

مسلم نوجوانوں کی بیداری کی ضرورت اوران کا مطلوبہ کردار

مجیب الرحمٰن عتیق ندوی

کسی ملت اورقوم کے لئے نوجوان سرچشمۂ قوت، اوررگ حیات ہوتے ہیں، امید کی طلعت اور قوم کا مستقبل ہوتے ہیں، ان کا عزم جواں، سوز دروں، ہمت ومردانگی، فکر وعمل، جذبہ وقربانی قوموں کا اصل سرمایہ ہے، ان کے دست وبازو کی قوت سے تہذیبوں نے جلا پائی ہے، ان کی فکری بلندیوں نے کتنی بار ثریا کو شرمسار کیا ہے، ان کے فولادی عزم نے بارہا طغیانی موجوں کا رخ موڑا ہے، ان کی آتش غیرت سے برق وطوفاں سہم گئے ہیں، وہ بھی جوانان تاریخ تھے، جن کی ٹھوکر سے صحرا ودریا دونیم اورسمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی تھے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نوجوانوں کو اہمیت وخصوصیت عطا کی ہے، ان کی تربیت کے رہنما خطوط متعین کئے ہیں، ان کے لئے قرآن مجید میں جابجا نمونۂ عمل ذکر کیے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کی ہمت افزائی فرمائی ہے، ان کی قوتوں کو صیقل کرکے میدان حیات میں اتارا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ ان نوجوانوں نے علمی، دعوتی، فکری، اصلاحی، اور جہادی کارناموں کے سنہرے ابواب رقم کیے ہیں، قرآن مجید میں نوجوانوں کی قربانی، عزم وہمت، اصابت رائے، جرأت وبیباکی، حوصلہ مندی، اورحق گوئی کے متعدد واقعات نقل کئے گئے ہیں، ہم مختصرا ذیل میں چند اشارے ذکر کرتے ہیں،

۱- قرآن مجید میں أبوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفۂ حیات کے چند ابواب تابندہ ذکر کئے گئے، جن میں ان کی قربانی، حق گوئی، دعوت حق کے راستے میں استقامت وجرأت، شرک واہل شرک سے نفرت وبے زاری، اللہ سے محبت وتعلق اور اس کے لئے ہر چیز کی قربانی، اور ہر میدان ابتلاء وامتحان میں ثبات قدمی ان کی زندگی کے تابناک اسباق ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کو خدائے ذوالجلال نے طغرۂ خلت سے سرفراز فرمایا، ان کی اولاد میں نبوت کے ذریں سلسلہ کو قائم فرمایا، ان کی صفت ''حنیفیت'' کو نشان وفا قرار دیا، ان کی قربانی وجذبہ کی نقل کو قیامت تک پرستاران توحید کے لئے ضروری قرار دیا، ان کے سر پر امامت وقیادت امم کا تاج مرصع رکھا، ارشاد خداوندی ہے: واذابتلی ابراھیم ربہ

بکلمات فأتمهن ،قال انی جاعلك للناس اماما،(جب ابراہیم کے رب نے ان کو چند باتوں میں آزمایا،اورانہوں نے اس کو پورا کیا،اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں انسانوں کا امام بناؤں گا،)

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حضرات ابراہیم کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں،ان کے متعدد اوصاف وامتیازات بیان کئے گئے ہیں،ہم یہاں پر مضمون کی مناسبت سے صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کریں گے،

شرک واہل شرک کی نفرت اور ان سے بیزاری،شعائر شرک سے نفرت ان کے رگ وریشہ میں تھی،قوم کو توحید اور اس کے نور وشفافیت کی طرف دعوت دیتے تھے،ہر قلب کو جھنجوڑتے،ہر ضمیر پر دستک دیتے،انسانوں کو مٹی وپتھر کی بندگی سے آزاد کر کے ایک خدائے ذوالجلال کی بندگی کی طرف بلاتے ،مگر قوم کی مخالفت وعناد،اور سرکشی وتکبر نے ایک نہ سنی، ان محروموں نے مخالفت کا علم بلند کیا، پوری قوم سرکشی پر آمادہ، ہر ہر فرد دشمنی پر تلا ہوا، باپ اور بھائی بندے دھمکیوں کے نشتر لئے ہوئے،ایسے میں غور کا مقام ہے کہ بادۂ توحید سے سرشار ایک نوجوان کس عزم وہمت،حوصلہ وپامردی کے ساتھ کہتا ہے'' تالله لاكيدن اصنامكم بعد ان تولوا مدبرين"

انہوں نے ان کے معبودان باطل کو پاش پاش کر دیا، جب لوگوں نے پوچھا کہ یہ کس نے کیا ہے،تو برملا جواب دیا کہ اپنے اس بڑے دیوتا سے پوچھو،اور اس تدبیر محکم سے نہ صرف مٹی وپتھر کے خود تراشیدہ خداؤں پر ضرب لگائی بلکہ قوم کے دلوں میں موجودان کی خدائی کے عقیدہ کو متزلزل کر دیا،جس کی ضرب کاری کے آگے قوم کی ہر تدبیر بیکار ہوگئی،انکی حجت اور قوت استدلال کے آگے انکی زبانیں گنگ ہوگئیں، یہی وہ جرأت رندانہ،حوصلہ وہمت کا واقعہ ہے جسے قرآن مجید نے یوں ذکر کیا ہے:قالوا سمعنا فتى يذكرهم يقال له ابراهيم(قوم نے کہا: ہم نے ایک نوجوان کے بارے میں سنا ہے،جس کا نام ابراھیم ہے،)

قرآن مجید میں اس موقع پر صاف بیان کیا گیا ہے، کہ قوم خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ شرک بیزار،مٹی وپتھر کی خدائی سے متنفر،توحید سے سرشار،جری وبیباک ایک نوجوان ہے، جو اتنا بڑا کام کر سکتا ہے، جو باطل اور معبودان باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کر سکتا ہے،جس زمانے اور جس قوم میں ہر فرد ان خداؤں کی بندگی کرتا ہو، وہ ایک ضرب تازیانہ سے ان کی بےبسی ومجبوری کا پردہ چاک کر سکتا ہے، عزم وہمت، حوصلہ وبلندی، صلابت واستقامت، اور باطل کے خلاف تدبیر محکم، جرأت وبے باکی ،دعوت توحید کے لئے جذبۂ دروں کی یہ عظیم مثال ایک ''نوجوان'' ابراہیم کی آج بھی منارۂ نور ہے،

۲-اسی طرح قرآن مجید میں ایک مثال نوجوانوں کے لئے اصحاب کہف کی بیان کی گئی ہے،''انهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى'' یہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت وتوفیق میں اضافہ کر دیا،اصحاب کہف چند کفن بردوش،اور اصحاب ہمت وعزیمت نوجوان تھے،جن کے کردار اور قربانی، باطل خدائی

کے آگے توحید وایمان اور ایک خدا کے کلمۂ حق پر قائم رہنے کو قرآن مجید نے بیان کیا، چند مٹھی بھر نوجوان تھے جنہوں نے افراد وشخصیات سے نہیں بلکہ پوری حکومت سے، باطل خدائی سے، اور اس کا دم بھرنے والوں سے پوری جرأت وبیبا کی، اور قوت واعتماد سے کہا تھا، ''ربنارب السموات والارض ،لن ندعو من دونه الها ،لقد قلنا اذا شططا'' ان کے اس عظیم بے باک کردار کو قرآن مجید نوجوانوں کے سامنے رکھتا ہے،

۳- ان ہی مثالوں میں قرآن مجید نوجوانوں کے سامنے اسوۂ یوسفی کو بیان کرتا ہے، جو اپنے اندر عظیم اسباق ودروس رکھتا ہے، یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، اسوہ یوسفی کیا ہے، ایک نوجوان مشکلات ومصائب ،اور آزمائش وآلام کے جھلستے صحراء سے گذرتا ہے، صبر وہمت کا کوہ گراں ہر مشکل میں ثابت قدم رہتا ہے، قدر ناشناس، کور نگاہ، کوتاہ بیں اس مرد قلندر کو ''بثمن بخس دراهم معدودة'' سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، مگر یہ نوجوان'' فصبر جميل والله المستعان على تصفون '' کا پیکر تھا جو ہر ابتلاء سے ایسے نکلتا جیسے شمشیر صیقل ہوکر نکلتی ہے، ان ہی آزمائشوں میں ایک ایسا بھی موقع آتا ہے جس کے آگے قائم رہنا آسان نہیں ہوتا، بسا اوقات انسان نے پہاڑوں کو سر کیا ہے، تھپیڑوں سے پنجہ آزمائی کی ہے، مگر نفس امارہ کی ایک ضرب کو نہ سہ سکا، انسان سمندر کی موجوں سے ہراساں نہیں ہوتا، پہاڑ کی چٹانوں سے نہیں گھبراتا، برق وباراں سے نہیں لرزتا، مگر نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی معمولی ضرب سے ڈھیر ہوجاتا ہے، حضرت یوسف کی فضیلت اور سیرت وکردار کی شفافیت پر نفس انسانی سب سے بڑا فتنہ بھی داغ نہ لگا سکا، اس لئے زنداں میں ڈالے گئے کہ معصیت کے آگے سر نہیں جھکایا، اور ''ان هذا الا ملك كريم '' کی تصویر مجسم بنے رہے، ان کے عزم وحوصلے اور ہمت وجرأت نے جیل میں بھی زمزمۂ توحید بلند کیا، تا آنکہ مصر کی کنجیاں اپنے دست امانت وحفاظت میں لے لیں، مولانا آزادؒ کے الفاظ میں:

''ان کی سیرت کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے، کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے، اور اگر یہ فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لئے فتح وکامرانی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں، جب بھی وہ اپنی راہ نکالے گا، دنیا کے سارے سمندر اس کی راہ میں حائل ہوجائیں جب بھی اس کی راہ نہیں رکے گی، حوادث ووقائع اس پر قابو نہیں پاسکتے، احوال وظروف اس پر غالب نہیں آسکتے، افراد وجماعات کی کوششیں اسے مسخر نہیں کرسکتیں، اس کے لئے ہر حال میں کامرانی ہے، اس کے لئے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے، اس کے لئے ہر طاقت پر فرماں روائی ہے، وہ اعمال ونتائج کی اس امتحان گاہ میں صرف اسی لئے ہے کہ سر بلند ہو، عجز ودرماندگی کی آلودگی اسے کبھی چھو نہیں سکتی''

قرآن مجید میں اور بھی مثالیں اور نمونۂ عمل نوجوانوں کے کردار کے لئے موجود ہیں، ہم یہاں صرف ان ہی اشارات پر اکتفاء کرتے ہیں، ذخیرہ احادیث اور سیرت نبوی پر نظر ڈالئے

تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیسے نوجوانوں کو اہمیت دی ہے،ان کی ہمت افزائی فرمائی ہے،ان پر اعتماد کیا ہے،،نوجوانوں کو دعوتی،اصلاحی اور قائدانہ ذمہ داریاں سپرد کی ہیں،سیرت پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے روز اول سے نوجوانوں پر توجہ مرکوز کی ہے،اوران کی ایسی تربیت فرمائی کہ ان کے ذریعہ تاریخ ساز کام انجام پائے ہیں، فاران کی چوٹیوں سے اسلام کی کرنیں طلوع ہونے کے بعد وہ ایک ہاشمی نوجوان ہی تھا جس نے دعوت کے میدان میں حضور ﷺ کے دست وبازو بننے کے لئے پوری ہمت وشجاعت کے ساتھ اپنے آپ کو پیش کیا تھا،اسلام کی سب پہلی درسگاہ دارارقم میں تربیت پانے والے نوجوانوں میں وہ شاہینی نظر پیدا ہوئی تھی جس پر تاریخ کو حیرت ہے، میں صرف ایک مثال یہاں پیش کروں گا،

مکہ مکرمہ میں جب مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا،تو آپ ﷺ کے حکم سے صحابہ کے ایک وفد نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی،مکہ کے لوگوں نے تعاقب کیا اور بالآخر وہ بھی شاہ حبشہ کے دربار میں جا پہنچے ،وہ چند مظلوم وستم رسیدہ اور شاہی درباروں کے رسم وراہ سے ناواقف نوجوانوں کی ایک جماعت تھی،اورادھر پختہ عقل،دانشوران قوم،اور شاہوں کے مزاج ودربای آداب سے واقف لوگوں کا وفد تھا،جنہوں نے شاہ حبشہ سے شکایت کی کہ چند غلام ہیں جو اپنے آقاؤں کی اجازت کے بغیر بھاگ آئے ہیں،ایک نیا دین ایجاد کیا ہے،نہ وہ آپ کا دین ہے، نہ ہمارا دین ہے،اور نہ کوئی دنیا میں اس کا قائل ہے،اہل ایمان کی اس جماعت کو بادشاہ نے بھرے دربار میں بلایا،تاکہ حقیقت معلوم کرکے انہیں سرزنش کی جائے، نوجوانوں سے سوال کیا گیا،کہ یہ کون سا دین ہے جو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے،ایک نوجوان صحابی رسول جعفر بن أبی طالبؓ جو نشۂ توحید سے سرشار اور دین حق کا علمبردار تھا،آگے بڑھا اور یوں گویا ہوا:

''اے بادشاہ! ہم جاہل قوم تھے،مردار کھاتے تھے،بتوں کو پوجتے تھے،برے کام کرتے تھے،قطع رحمی کرتے تھے، ہم میں سے طاقتور کمزوروں کو کھا جاتا تھا،ہماری یہی حالت تھی کہ اللہ نے ہم ہی میں سے اپنے ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا،جس کی راست بازی،امانت ودیانت اور پاکیزہ نسب سے ہم واقف ہیں،اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا،توحید ومساوات کا درس دیا،شرک واصنام پرستی سے روکا،سچائی وپاکیزگی، عدل ومساوات اور ادائیگی حقوق وامانت داری کا حکم دیا،جھوٹ وفریب ،شرک وبداخلاقی،بدکرداری،ظلم وستم سے،یتیموں کا مال کھانے سے ہمیں منع کیا،ہمیں حکم دیا کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں،نماز ادا کریں،زکوۃ دیں،روزہ رکھیں،اس طرح انہوں نے احکام اسلام بیان فرمائے،اورفرمایا:''پس ہم نے اس کی تصدیق کی،اس پر ایمان لے آئے،اس کے لائے ہوئے دین کی اتباع کی،ہماری قوم ہماری جان کی دشمن بن گئی،ہمیں مشق ستم بنایا،ظلم کا ہر حربہ ہمارے اوپر استعمال کیا، تاکہ ہمیں ہمارے دین سے پھیر دیں،پاکیزگی سے نکال کر خبائث،نور توحید سے نکال کر ظلمت شرک میں پھر سے ہمیں دھکیل دیں،جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا،ہمارے اوپر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا،خدا کی زمین پر اس کا نام لینا ہمارے

لئے مشکل ہوگیا، ہم آپ کے پاس اس امید سے آئے کہ یہاں ہمارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی، ظلم نہیں ہوگا، اے بادشاہ! ہم نے اس لئے آپ کا انتخاب کیا کہ ہمارے اوپر آپ کی مملکت میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی، اس کے بعد انہوں نے نجاشی کی طلب پر قرآن مجید کی آیات تلاوت فرمائیں،

اللہ اکبر! ایک طرف حق کی طاقت، اور دوسری طرف حضرت جعفرؓ کی بے باکی وخود اعتمادی، حق گوئی وجرأت، اپنے عقیدے پر مکمل قناعت واطمینان، شرک سے بیزاری، اور ایمان کے ذریعہ ایک روحانی قوت وشوکت کی یافت کا احساس تھا جو الفاظ کے قالب میں ڈھل کر اس طرح نکلا کہ مسیحیت کی قلمرو میں شہنشاہ وقت اور بڑے بڑے پادری اشکبار ہوگئے، مسیحیت کے عقیدہ میں تزلزل آ گیا، ایک نوجوان حضرت جعفر کی یہ تقریر صرف زور خطابت کا ایک نمونہ نہیں بلکہ جاہلیت واسلام، کفر وایمان، حق وباطل کے مابین ایک خط امتیاز ہے، حق وایمان کے ذریعہ حاصل ہونے والی فکری وشعوری بلندی، اور کفر وشرک کے ذریعہ انسان کی شقاوت ومحرومی کے احساس کی سچی تصویر ہے،

عہد صحابہ میں صرف یہ ایک مثال نہیں، بلکہ حضرت مصعب بن عمیرؓ، معاذ بن جبلؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، سلمان فارسیؓ، معوذ ومعاذؓ، سعد بن عبادہؓ، خالد وابوعبیدہ بن جراح، ربعی بن عامرؓ، زبیر بن العوام..... وغیرہ یہ سب گلدستہ انسانیت کے وہ سنبل وریحان، اور سرووسمن ہیں، جن میں سے ہر ایک نے انسانیت کے لئے حسن وجمال کا سامان فراہم کیا، اس کی پیشانی کو چمکایا اور اس کے دامن کو موتیوں سے بھرا ہے، ان کے ذریعہ علم وتمدن نے جلا پائی ہے، ان فاقہ مستوں کے ذریعہ قیصریت وکسرویت اور ان کے فخر وپندار کا خاتمہ ہوا ہے، تہذیب کی شمعیں روشن ہوئی ہیں، وہ محض خاک کی آغوش میں وظیفۂ تسبیح ومناجات کے قائل نہ تھے بلکہ وسعت افلاک پر تکبیر مسلسل کا عزم جواں رکھتے تھے، اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا تھا۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نوجوانوں میں بڑی قوت اور صلاحیتیں پنہاں ہوتی ہیں، اگر ان کی تربیت کی جائے، ان کے احساس ذمہ داری اور شعور کو مہمیز کیا جائے، ان کی خودی کی تعمیر کی جائے، تو بڑے بڑے کام انجام پاسکتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کی ہمت افزائی فرمائی ہے، ان کی رائے پر فیصلے کئے ہیں، جوانی کی عبادت پر بشارتیں سنائی ہیں، نوجوانوں کو محبت وشفقت کے ساتھ قریب فرمایا ہے، ان کی صلاحیتوں سے کام لیا ہے، دعوتی مشن، سفارت پر روانہ کیا، لشکروں کی کمان شیوخ واکابر کی موجودگی میں نوجوانوں کو عطا کی ہے، تعمیر انسانیت، علم ودعوت کے کام سپرد کئے ہیں، مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے مختلف شعبوں میں ذمہ داریاں ان کے حوالہ کی ہیں،

آج دنیائے انسانیت جن مشکلات سے دوچار ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں، سیاسی وتہذیبی یلغار ہے، اخلاقی قدروں کا فقدان ہے، اخلاق باختگی وعریانیت کا دور دورہ ہے، بالخصوص استعماری طاقتیں عالم اسلام پر اپنے شیطانی منصوبوں کے پیش نظر ظلم وستم کا ہر حربہ استعمال کر رہی ہیں، انسانیت دشمن تخریب کاروں

نے انٹرنیٹ اور فحش میڈیا کی گرم بازاری سے اخلاق وکردار،طہارت وپاکیزگی،اورحیاء وعفت کا تقریبا خاتمہ کردیا ہے،ایسے میں خاص طور سے مسلم نوجوانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مقام وحیثیت سے آگاہ ہوں، بیدار ہوں، ذمہ داری کا شعورواحساس پیدا کریں،اور معاشرہ کی اصلاح وتربیت ،انسانیت کی قیادت ورہنمائی میں مطلوب کردار ادا کریں،اس کے لئے چندامورذیل میں ہم ذکرکرتے ہیں

۱- نوجوانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عقیدہ وایمان، دین ومذہب پراعتماد بحال کریں، غیرمتزلزل یقین پیدا کریں، وہ اس حقیقت کا ادراک وشعور پیدا کریں کہ ان کے سینے میں راز زندگی پوشیدہ ہے، وہ جس دین کے حامل ہیں وہی انسانیت کے درد کا درماں،غموں کا علاج،اورترقی کا ضامن ہے،اسلامی نظام وتہذیب ہی دنیا کو ہمہ جہت فساد وتباہی سے بچاسکتی ہے،اسلام محض چندرسم ورواج کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک جامع نظام زندگی ہے،وہ عقیدہ ودین بھی ہے،سیاسی ،تعلیمی ،تہذیبی،تمدنی،معاشی ،اخلاقی کامل ومکمل دستور حیات بھی ہے،وہ حیات انسانی کے ہر مسئلہ کا حل کرتا ہے،زندگی کے الجھے ہوئے ہرگیسوکوسنوارتا ہے،یہی وہ یقین محکم ہے، جو مردوں کے لئے جہاد زندگانی کی شمشیر آبدار ہے،وہ تاجر کیا کرسکتا ہے،جو اپنی پونجی اور سرمائے سے غافل ہو،یااس کی قدر وقیمت سے ناواقف ہو،

۲-نوجوانوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے دین ومذہب،اورفکروتہذیب پرغیرمتزلزل ایمان کے بعداس کی راہ میں قربانی کا جذبہ صادق پیدا کریں،اس متاع عزیز کو دنیا کی ہر شے سے مقدم رکھیں،اس لئے کہ ''نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر'' ریب وتذبذب کے بیماروں،یا مقصدکوعزیز نہ رکھنے والوں نے کوئی کارنامہ نہیں انجام دیا،

۳-اپنے اندرطموح وبلندی پیدا کریں،ان کی سعی وجستجو محض دوکف جو کے لئے نہ ہو،پرواز میں کوتاہی پرموت کو ترجیح دینے کا حوصلہ اپنے سینوں میں رکھتے ہوں، بے مقصد زندگی گذارنے کے بجائے محکم لائحہ عمل رکھتے ہوں،وہ ایسا کردار بلند رکھتے ہوں کہ فضائے بسیط کی کہکشائیں اور سمندروں کی موجیں بھی ان کے قدموں میں آجائیں توان کا دامن مرادنہ بھرسکے،اقبال مرحوم کے الفاظ میں:

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند وتیز
ساحل تجھے عطاہو تو ساحل نہ کر قبول

ہماری تاریخ کا ہرورق، بلکہ ہرباب نوجوانوں کے روشن کارناموں سے تابندہ ودرخشندہ ہے، جب جب بھی نوجوان بیدار ہوئے ہیں،ان میں شعور وادراک نے انگڑائی لی ہے،اوران کی خودی نے انہیں مہمیز کیا ہے،تو انسانیت کے گلشن میں بہار آئی ہے ،اصلاح وتعمیر کی نقش آرائی ہوئی ہے،نوجوانوں کی بیداری، اورقربانی وجدجہد،ان کا کردار معاشرہ کی ترقی وصلاح کی ضمانت اوراس کے عروج کا راز ہے،خلاصہ یہ ؎

اس قوم کو شمشیر کا حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

☆☆☆

توجہ طلب مسئلہ

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

(ملت کا اس وقت اہم ترین توجہ طلب مسئلہ)

محمد الیاس ندوی بھٹکلی

دل دہلادینے والا واقعہ :۔ واقعہ ماضی بعید یا ماضی قریب کا نہیں بلکہ صرف چند سالوں پہلے کا ہے، غیروں سے متعلق نہیں بلکہ اپنوں اور ایمانی بھائیوں کا ہے، پرانے زمانے کے جاہلوں کا نہیں بلکہ اس ترقی یافتہ سمجھے جانے والے زمانہ کے پڑھے لکھے گھرانوں کا ہے، قصہ اتنا ہلکا بھی نہیں کہ اس کو سن کر نظر انداز کردیا جائے بلکہ کمزور سے کمزور ایمان والوں کے دلوں کو دہلا دینے اور ہوش اڑانے والا ہے۔

جامعہ کے مہتمم مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے ساتھ ہم جامعہ کے اساتذہ کا ایک وفد ایک دورہ سے واپسی میں منگلور سے کچھ دور دھرمستلہ مندر کے پجاری ڈاکٹر ویریندر ہیگڈے سے ملنے کے لیے گیا تاکہ بھٹکل میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صدارت میں ہونے والے کامیاب وعظیم الشان تاریخی جلسہ پیام انسانیت میں ان کی شرکت اور ملک میں بھائی چارگی وانسانیت کے موضوع پر ان کی مؤثر تقریر پر ان کا شکریہ ادا کیا جائے، پورے ملک میں دھرمستلہ کا یہ تاریخی مندر بڑی اہمیت کا حامل ہے، ملک کے اکثر صدور ووزراء عظم یہاں آتے ہیں، دس ہزار سے زائد لوگوں کے بیک وقت روزانہ مفت کھانے کا ان کے یہاں انتظام ہوتا ہے، صفائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، مندر میں ڈالے جانے والے صرف نذرانوں سے انہوں نے مندر ٹرسٹ کے تحت لاکھوں طلباء کی تعلیم کا نظم کیا ہے، صوبہ بھر میں ان کے درجنوں تعلیمی ادارے پھیلے ہوئے ہیں، انجینئرنگ اور میڈیکل کالج تک کا انہوں نے اپنی قوم کے لیے انتظام کیا ہے، ہماری درگاہوں میں ڈالے جانے والے نذرانوں وعطیات کے متولیوں وذمہ داروں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر ویریندر ہیگڈے صبح مقررہ وقت پر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر آنے والے ہزاروں عقیدت مندوں کو دور سے ہی صرف اپنے دیدار کا موقع دیتے ہیں، ہم لوگوں نے اپنے آنے کی جب ان کو اطلاع دی تو انہوں نے ہمیں استقبالیہ میں اکرام سے بٹھایا اور خود ہم سے ملنے جلد فارغ ہوکر ہماری نشست گاہ میں آگئے، تقریباً آدھ گھنٹے تک بے تکلف گفتگو کرتے رہے، مفکر اسلام سے بھٹکل میں اپنی ملاقات اور اس

آخری عمر میں بھی ان کی ملک ووطن کے لیے محبت وفکرمندی پر اپنی غیر معمولی مسرت بلکہ حیرت کا اظہار کیا، باتوں باتوں میں ہم مسلمانوں سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہمارے یہاں سے غریبوں کی مدد کا سلسلہ زمانہ دراز سے جاری ہے ،اس سے بڑی تعداد میں مسلمان گھرانے بھی فائدہ اٹھارہے ہیں جس میں بڑی تعداد برقعہ پوش مسلم خواتین کی بھی ہے،ہم نے پوچھا کہ اس کا کیا طریقہ ہے، کہنے لگے ایک فارم دیا جاتا ہے جس میں مدد طلب کرنے والا منجوناتھ سوامی بت کی قسم کھا کر اس سے مدد طلب کرتے ہوئے اس کو مخاطب کرتا ہے اور اپنی ضروریات وحاجات کو پورا کرنے کی اس سے درخواست کرتا ہے، یہ سننا تھا کہ ہمارے رونگھٹے کھڑے ہوگئے، ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، پیروں تلے زمیں کھسکنے لگی، ہم جب شہر آئے اور اپنے احباب میں اس ناقابل یقین ایمان سوز واقعہ کا ذکر کیا تو ہمارے ایک ساتھی نے اس سے زیادہ دل دہلا دینے والے ایک اور حادثہ کا ذکر کرکے ہمارے ہوش اڑا دیئے ،اس نے بتایا کہ شہر سے سو کلومیٹر کے فاصلہ پر لکشمی شور مندر میں کچھ دن پہلے ایک نہایت دیندار، متدین اور پنج وقتہ نمازی شخص کو دیکھا گیا جو اپنے گھریلو مسائل والجھنوں میں مبتلا ہوکر عملیات کے چکر میں ازالہ سحر کی خاطر وہاں علاج کے لیے پہنچ گیا تھا، جہاں کا معمول یہ ہے کہ ہر آنے والے شخص کو مندر میں موجود بت کے طواف کرانے کے بعد ہی اس کی گذارشات ومعروضات کو سنا جاتا ہے، اس اللہ کے بندہ سے بھی یہ عمل کرایا گیا، انھوں نے بتایا کہ مسلم خاندانوں کا لکشمی شور جانے کا سلسلہ زور وشور سے کئی مہینوں سے جاری ہے۔

دونوں واقعات کے محرکات :۔ حدیث شریف میں آتا ہے فقر بُری بلا ہے، کبھی انسان کو تنگدستی کی حالت کفر تک بھی پہنچا دیتی ہے، پہلے واقعہ میں کچھ یہی معاملہ تھا، ان مسلم گھرانوں کو مالی مشکلات اور فقر وفاقہ نے دھرمستلہ مندر جاکر شاید اس کفریہ عمل کو کرنے پر مجبور کردیا تھا، دوسرے واقعہ میں گھریلو مسائل، ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں نے ان اللہ کے بھولے بھالے بندوں کو شرکیہ کام کرنے پر آمادہ کردیا تھا لیکن حدیث شریف میں جس فقر کا ذکر ہے وہ موت تک پہنچانے والا فقر ہے، جان لیوا تنگدستی ہے ، اس زمانہ میں ہمارے معاشرہ میں کم از کم کوئی ایسا تنگدست نہیں ہے جس کو فاقہ کشی میں جان بچانے کے لیے یہ کفریہ عمل کرنا پڑتا ہو، بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرنے والے اب دیکھنے کو ہی نہیں بلکہ سننے کو بھی نہیں ملتے ،اسی طرح جن مسائل ومشکلات اور ذہنی الجھنوں وگھریلو پریشانیوں سے تنگ آکر غیر اسلامی عملیات اور شرکیہ کاموں کو ذریعہ بنا کر اس کے ازالہ کی کوشش کی جاتی ہے اس کا تعلق بھی زیادہ تر توہمات سے ہوتا ہے اور توہم ایک ایسا مرض ہے جس کا دنیا میں کہیں کوئی علاج نہیں، سحر، جادو اور باہری اثر کی بار بار رٹ نے ہماری موجودہ سوسائٹی میں انسانوں کی توجہات کو امراض جسمانی کے اصل حقائق، اور اس کے اصل محرکات پر توجہ مبذول کرنے سے اچھے اچھوں کو روک دیا ہے، ہمارا یہ حال ہے کہ دعوت میں تیز مرچوں والا مصالحہ دار اور ہضم نہ ہونے والا کھانا پیٹ پھولنے تک نہیں بلکہ سانس پھولنے تک کھائیں گے، اس کے بعد دست اور اجابت کی شکایت ہوگی اور ایک آدھ دن میں افاقہ نہیں ہوگا تو تیسرے دن مریض یا اس کے گھر والے یا اس سے

ملنے والے اس کو مشورہ دیں گے کہ یہ شاید باہر کا اثر ہے، کسی اچھے عامل سے جانچ کرالیں، بیٹی گھر میں بن بیاہی بیٹھی ہے، نسبت طے نہیں ہورہی ہے، 6/8 ماہ بعد کوشش میں ناکامی کے بعد ہی شور مچنے لگتا ہے کہ کسی نے بندش کردی ہے، جہاں بھی جاتے ہیں لوگ بچی کو پسند کرتے ہیں لیکن عین موقع پر انکار کردیتے ہیں، نظر اس پر نہیں جاتی کہ باپ یا بھائیوں میں سے کوئی شہر بھر میں اپنی کسی حرکت کی وجہ سے بدنام ہے، اسی لیے اس گھر سے بچی کو اپنے یہاں لوگ لے آنا نہیں چاہتے، بچہ شہر سے باہر یا بیرون ملک جاکر نوکری کی تلاش میں 6/7 ماہ سے کوشش کررہا ہے لیکن کہیں ملازمت نہیں مل رہی ہے، دل میں فوراً بات آتی ہے کہ شاید کسی نے نوکری نہ ملنے کے لیے سحر کردیا ہے، اس کا استحضار نہیں رہتا کہ ہمارا بچہ اپنے پچھلے کسی کرتوت کی وجہ سے اچھی نظروں سے دیکھا نہیں جارہا ہے اس لیے اس کو کوئی اپنے یہاں ملازمت دینا پسند نہیں کرتا، ایک صاحب نے تو حد کردی، ان کی بچی غلط صحبت اور بے جالاڈ پیار کی وجہ سے بگڑ گئی اور ایک دن اپنے دوست کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی، اس موقع پر اس باپ کو اپنی بچی کو یہ پیغام دینا چاہیے تھا کہ کل سے میرے گھر میں تمہارا داخلہ بند، بدنامی کے اس داغ کے ساتھ میرے گھر واپس نہ آنا، اس کے بجائے وہ صاحب سب سے کہتے پھرتے رہے کہ میری بچی پر کسی نے سحر کردیا اس لئے وہ گھر سے دوست کے ساتھ بھاگ گئی، دو دن تک بخار نہیں اترا تو تیسرے دن شبہ ہونے لگتا ہے کہ کسی عامل سے معلوم کرنا چاہیے کہ کہیں سحر کا اثر تو نہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ملیریا، فلو اور ٹائیفیڈ 6/7 دن تک جانے کا نام نہیں لیتے ہیں، بداحتیاطی سے کبھی جانے والا بخار پھر واپس آتا ہے اور یہ سلسلہ ہفتوں تک جاری رہتا ہے ان سب پر اب ہماری نظر نہیں رہتی، فوراً دل ہی میں نہیں بلکہ زبان پر بات آجاتی ہے کہ باہر کا اثر ہے، شاید سحر ہوگیا ہے، آج کل بعض معالج اور ڈاکٹر بھی اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے ان کی دواؤں پر جلد صحت یاب نہ ہونے پر کہہ دیتے ہیں کہ بیرونی اثر ہے، بیماری کچھ بھی نہیں، کسی عامل سے رجوع کرلیں تو بہتر ہے، اب تو حد ہوگئی، کینسر قدیم اور مہلک مرض ہے جو کسی سبب کے بغیر بھی کسی کو بھی آسانی سے آدبوچتا ہے، گذشتہ 4/5 سالوں میں کئی اعلی سطح کے دیندار لوگوں کو دیکھا گیا کہ ان کو اس بیماری کے لاحق ہونے اور اس کا پتہ چلنے کے بعد اعلان کردیا گیا کہ سحر کے ذریعہ اس بیماری میں ان کو مبتلا کردیا گیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ علاج سے توجہ ہٹ گئی اور پوری توجہ سحر کے توڑ پر ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے یہ سب اللہ کو پیارے ہوگئے۔

سحر کی شرعی حقیقت:۔ قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سحر یعنی جادو اپنی حقیقت رکھتا ہے، ہر ایک کے لیے حتی کہ انبیاء ورسولوں کے بھی ذاتی دشمن اللہ نے پیدا کئے جو ان کو جسمانی یا روحانی طور پر نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے، کسی سے حسد، کینہ، بغض انسانی فطرت میں داخل ہے، کسی کو اچھی حالت میں دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھنا کم ظرف انسانوں کا نفسیاتی مرض ہے، آپ کی نیک نامی ہورہی ہے، معاشرہ میں آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے، اللہ تعالی آپ کو مالی، دینی اور سماجی ترقیات سے نواز رہے ہیں، آپ کی شہرت بام عروج کو پہنچ رہی ہے، ہر جگہ آپ

کا چرچہ ہورہا ہے،اس پر آپ کا کوئی رشتہ دار، ساتھی ،دوست یا آس پاس رہنے والا کوئی بھی کینہ پرور شخص دل ہی دل میں کڑھنے لگتا ہے،اس پر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مجھے یہ نعمت ملے یا نہ ملے کم از کم اس سے تو ختم ہوجائے ،اس کے لیے وہ جان توڑ کوشش بھی کرتا ہے اور آخر میں سحر سے بھی مدد لیتا ہے جس میں شیاطین اور بدکردار جنات سے وہ تعاون لیتا ہے، یہ عمل پچھلی اقوام میں یہودیوں میں سب سے زیادہ تھا، حسد کے میدان میں ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا اور آج بھی ہے، حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں سحر کے اس عمل کو عروج حاصل ہوا، اس لیے کہ اس زمانہ میں جنات پر بھی ان کی حکومت تھی اور وہ ان کے لیے مسخر کردیئے گئے تھے،لیکن ایک سچے مؤمن کا عقیدہ اور اس کے ایمان کا جزء یہ ہے کہ وہ یہ یقین کامل رکھے کہ سحر بھی اللہ تعالی کی اجازت کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا،اللہ تعالی کا ارشاد ہے وَمَاهُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰه کہ سحر کے ذریعہ بھی کوئی اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

شاید آپ کو یقین نہ آئے :۔ایک عامل سے ہم نے اللہ کا واسطہ دے کر پوچھا کہ کیا بات ہے کہ آپ کے پاس علاج معالجہ کے لیے آنے والے مایوس نہیں جاتے ، کہنے لگے کیا مطلب ؟ میں نے کہا کوئی ایسا شخص آپ بتا سکتے ہیں کہ جس نے سحر کے شبہ میں آپ سے رجوع کیا ہو اور آپ نے یہ کہہ کر ان کو واپس کیا ہو کہ تم پر کوئی سحر کا اثر نہیں ،تم ٹھیک ہو، کہنے لگے کہ نفسیاتی طور پر ایسا کہنے سے ان کا ہم پر اعتماد اٹھ جائے گا اور وہ پھر کسی اور سے رجوع کر کے علاج کرائے گا، اس لیے ہم مجبوراً ان کو ایسا کہتے ہیں اور سحر و باہر کا اثر کہہ کر ان کا علاج کرتے ہیں۔

دلچسپ واقعہ :۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا، ایک صاحب کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ان پر سحر کا اثر ہے، ان کو ایک عالم دین کے متعلق کسی نے بتایا کہ تم ان سے رجوع کرو اور ان سے تعویذ لو، وہ انکار کریں گے پھر بھی تم اصرار سے ان سے چپکے رہنا، جب تک تعویذ نہ دیں نہ لوٹنا، وہ صاحب ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے صاف انکار کردیا کہ میں نے آج تک یہ کام نہیں کیا اور مجھے یہ عمل آتا بھی نہیں، وہ صاحب کسی صورت ان سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے اور ہر حال میں تعویذ لے کر ہی جانے کے عزم مصمم پر قائم تھے، بالآخر انہوں نے ایک پرچی منگوائی، اس پر کچھ لکھا اور اس کو بند کر کے تعویذ کی شکل میں ان کے حوالہ کر کے ان سے کہا اس کو ایک ہفتہ تک ہاتھ پر باندھ کر رکھنا، نہ خود کھولنا اور نہ کسی کو دیکھنے دینا، اگر ایسا کیا تو الٹا اس کا اثر ہوگا، ایک ہفتہ بعد آ کر مجھ سے ملنا اور بتانا کہ کیا صورت حال ہے، وہ صاحب خوش ہوئے ،ایک ہفتہ بعد لوٹے اور کہنے لگے،مولانا:۔ آپ کی تعویذ بڑی مؤثر تھی ،سحر ختم ہوا اور میں اچھا ہوگیا، انھوں نے اسی وقت ان کی تعویذ نکال کر کھول کر اس میں موجود الفاظ ان کو سنائے ،اس میں لکھا تھا ''اے اللہ:۔ یہ تیرا بندہ میرے پاس سے واپس جاتا نہیں اور میں تعویذ دیتا نہیں اور مجھے یہ کام آتا نہیں، اے اللہ:۔ تو ہی اس سے نپٹ لے'' وہ صاحب یہ مضمون دیکھ کر منہ تکتے رہ گئے ، عالم دین نے کہا کہ آپ نفسیاتی مریض تھے،آپ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ

میرا علاج فلاں سے ہی ہوگا، آپ کے گمان کے مطابق جب میں نے علاج شروع کیا تو آپ کا مرض بھی زائل ہوگیا۔
کاش وہ بندہ ان کے بجائے اللہ تعالی سے ہی اسی یقین کے ساتھ مانگتا تو اس کا ایمان بھی بچتا اور علاج بھی ہوتا۔

عملیات میں شرکیہ عمل کا ارتکاب :۔ اکثر تعویذوں کو کھول کر دیکھنے سے معلوت ہوتا ہے کہ اس میں شرکیہ الفاظ لکھے ہوتے ہیں، غیر اللہ کو مخاطب کر کے ان سے مدد طلب کی جاتی ہے، اولیاء اللہ، بزرگان دین اور فرشتوں کے نام اس میں درج ہوتے ہیں، آج کل کاروبار میں برکت کے لیے دکانوں اور آفیس وغیرہ میں فریم کے اندر جو الفاظ درج ہوتے ہیں اس پر غور کریں تو کمزور صاحب ایمان کا بھی خون کھولنے لگتا ہے، لکھا ہوتا ہے یاجبریل یا میکائیل المدد المدد۔ ایک صاحب کو دیکھا صبح دوکان کھلتے ہی جیب سے ایک پرچی نکالی، اس کو کچھ دیر تک دیکھتے رہے پھر اس کو جیب میں رکھ دیا، میں نے اصرار کے ساتھ وہ پرچی لے کر دیکھی تو اس میں لکھا تھا، دوکان وکاروبار میں برکت کے لیے صبح دوکان کھلتے ہی ان الفاظ کو دیکھیں، نیچے تحریر یہ تھی (کھیعص، یسٓ، طٰہٰ، الٓمٓ وغیرہ) کچھ دنوں کے بعد پھر ان کے یہاں جانا ہوا، اس کاغذ کو انہوں نے اب فریم بنوا کر اپنے ٹیبل کے اوپر لٹکا دیا تھا۔

ایمان صرف اللہ تعالی کے ایک ماننے کا نام نہیں :۔ کیا غیر اللہ کے علاوہ کسی نبی یا رسول یا فرشتے کے ہاتھ میں نفع نقصان کی قدرت ہے؟ کیا اللہ رب العزت کے علاوہ کوئی مخلوقات کی پکار سن سکتا ہے؟ کیا سمیع وبصیر رب العزت کے علاوہ کسی کے پاس انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی قدرت ہے؟ اگر ہم نے بھی غیر اللہ کو نافع وضارّ سمجھ لیا تو غیروں میں اور ہم میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ اگر ہم نے بھی کسی رسول یا نبی یا فرشتہ و بزرگ کو پکار کر یہ سمجھ لیا کہ وہ ہماری حاجتوں کو پورا کر سکتے ہیں تو یہود ونصاری اور ہم میں کیا امتیاز رہ جاتا ہے؟ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے لکھا ہے کہ شرک صرف مندر میں جا کر گھنٹی بجانے ہی کا نام نہیں بلکہ اللہ تعالی کے متعلق اس کی قدرتوں واختیارات کے منافی غلط خیالات کے آنے کا نام بھی کفر وشرک ہے، ہم اپنی اولاد کو نواقض وضو، مبطلات صلاۃ، نواقض غسل تو یاد کراتے ہیں لیکن نواقض ایمان اور مبطلات اسلام سے باخبر نہیں کرتے، ایمان صرف اللہ رب العزت کو ایک ماننے کا نام نہیں بلکہ اس کی تمام صفات وکمالات اور قدرتوں کے ساتھ اس کو قادر ومالک ماننے کا نام ہے، ایمان کا ایک حصہ تقدیر پر ایمان لانا بھی ہے، اس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوسکتا، تقدیر کا مطلب ہے کہ ہمیں جو بھی نفع ونقصان پہنچنے والا ہے اس کا ہمارے علیم وخبیر رب کو پہلے سے علم ہے اور یہ سب اسی کے حکم سے ہوتا ہے، تقدیر پر ایمان کا حق یہ ہے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہو کہ کوئی شخص ذرہ برابر نقصان ہمارے رب کی اجازت ومنشا کے بغیر ہمیں نہیں پہنچا سکتا، قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ساری دنیا مل کر ہمیں تکلیف دینا چاہے تو بھی کوئی تکلیف نہیں دے سکتی الّا یہ کہ اللہ رب العزت کا حکم ہو، عزت

وذلت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، جو مصائب ،مسائل اور تکالیف آتی ہیں اس کو وہ ہمارے رب نے ہمیں پیدا کرنے سے پہلے ہی ہمارے لیے مقدر کر دیا ہے، اگر ہم گناہ گار ہیں تو اس سے ہمیں ان آزمائشوں سے متنبہ کر کے ہمیں اپنے سے رجوع کرنے اور سنبھلنے کا موقع اللہ دینا چاہتا ہے، اگر ہم نیک ہیں تو اس پر صبر کروا کر ہمارے درجات وہ بلند کرنا چاہتا ہے۔

پھر اس کا شرعی حل کیا ھے :۔ اللہ تعالی نے اس گندہ عمل یعنی سحر کا توڑ بھی اہل ایمان کو بتا دیا ہے، مدینہ کے یہودیوں نے رحمت عالم ﷺ کے خلاف آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے سحر کا سہارا لیا، آپ ﷺ پر اس کا ہلکا سا اثر ظاہر بھی ہوا لیکن آپ کو فوراً متنبہ بھی کر دیا گیا اور اس کے توڑ کے لیے قرآن مجید کی دو سورتیں معوذتین کی یعنی قل اعوذبرب الفلق اور قل اعوذبرب الناس اتاری گئیں، جیسے ہی یہ سورتیں نازل ہوئیں ،آپ ایک ایک آیت پڑھتے گئے اور آپ پر سے سحر کا پورا اثر ختم ہوا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی بندہ اس کو صبح شام تین تین دفعہ پڑھے گا اس کو صبح پڑھنے پر شام تک اور شام کو پڑھنے پر صبح تک اللہ تعالی سحر اور ہر طرح کی بلیات و آزمائشوں سے محفوظ رکھیں گے، رحمت عالم ﷺ اللہ تعالی کی طرف سے ہر طرح کے مصائب سے حفاظت کے وعدے کے باوجود یہ دونوں معوذتین کی سورتیں نہ صرف صبح شام تین تین مرتبہ بلکہ رات کو سوتے وقت بھی تین دفعہ اور ہر فرض نماز کے بعد ایک دفعہ پڑھنے کا معمول رکھتے تھے، اس ارشاد نبوی کے بعد صحابہ کرام کا معمول بن گیا کہ بیماروں اور بچوں پر جو اس کو پڑھ نہیں سکتے تھے پڑھ کر دم کرتے، تاریخ اسلامی میں ایسے سینکڑوں واقعات پیش آئے کہ جنہوں نے ان سورتوں کو پڑھنے کی پابندی کی ، ہزار کوششوں کے باوجود ان پر سحر کا اثر نہیں ہو سکا۔

جامعہ میں پڑھنے کے ابتدائی زمانہ میں مصلح امت شاہ ابرار الحق صاحبؒ نے ہم طلباء سے خطاب کرتے ہوئے اس کی تاکید کی تھی کہ عزیز طلباء:۔ آپ سب تین تین دفعہ صبح شام معوذتین یعنی سورہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھنے کا معمول رکھیں، اللہ تعالی آپ کو ہر قسم کی تکلیفوں بالخصوص سحر و حسد کے اثرات سے محفوظ رکھیں گے، جامعہ کے ایک سابق طالب علم پر سحر کا اثر ہوا ،وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں رہتے تھے میں نے ہر دوئی حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری پر اپنے اس دوست کے لیے دعا کی درخواست کی ،تو مولانا نے پوچھا کہ کیا وہ معوذتین پابندی سے نہیں پڑھتے تھے؟ اگر اس کا معمول رکھتے تو انھیں یہ دن دیکھنے نہیں پڑتے ، ان سے کہئے کہ روزانہ اس کا معمول رکھیں انہوں نے اس کا معمول شروع کیا تو سحر کا اثر بھی الحمدللہ ختم ہو گیا۔

بچوں کو نظر لگنا تو عام بات ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ نظر کا لگنا حق ہے، بچوں ہی کو نہیں بڑوں کو بھی بعض اوقات نظر لگ جاتی ہے، اچھی حالت میں دیکھ کر کسی کی اس پر نگاہ پڑ جاتی ہے تو اس کا الٹا اثر ظاہر ہوتا ہے، وہ بیمار ہو جاتا ہے یا بجھا بجھا سا رہنے لگتا ہے، رحمت عالم ﷺ جب

اپنی چہیتی صاحب زادی حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لاتے تو اپنے ننھے منے نواسوں حسن وحسین کو بلاکر یہ کلمات پڑھ کر ان پر دم فرماتے کہ میں اللہ تعالی کے تمام کلمات کے واسطہ سے شیطان، بری چیز اور نظر بد سے پناہ مانگتا ہوں (اَعُـوذُ بِـكَـلِـمَاتِ اللّٰهِ التّامّة، مِنْ كُلِّ شَيْطَان وَشَرّهَامَّة وَمِنْ كُلّ عَيْنٍ لَامَّةٍ)

ایک شخص نے سرکار دوعالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ مجھے رات بچھو نے ڈس لیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے شام کو یہ دعا کیوں نہ پڑھی کہ میں اللہ سے اس کی مخلوق کے شر سے پناہ طلب کرتا ہوں، ان سے آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم یہ دعا پڑھتے تو تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوتی (اَعُـوذُ بِـكَـلِمَاتِ اللّٰهِ الْتّامَاتِ مِنْ شَرِ ماَخَلَق) صبح شام جو یہ کہے کہ اللہ کی نام کی برکت سے اس کی اجازت کے بغیر زمین وآسمان میں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچاسکتی اور وہی تنہا سننے اور جاننے والا ہے، اس کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھا جاتا ہے (بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَايَضُرُّمَعَ اسْمِهِ شَئٌ فِىْ الْاَرْضِ وَلَافِى السَّماَءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم) حضرت عثمان کے صاحب زادے حضرت ابان کا معمول روزانہ اس دعا کے پڑھنے کا تھا ، ایک دن ان پر فالج کا اثر ہوا تو انھوں نے کہا کہ میں نے اس دن یہ دعا نہیں پڑھی تھی، حضرت ابوسعید اپنے ساتھیوں کے ساتھ جہاد میں گئے ہوئے تھے، وہاں ایک قبیلہ پر سے گذر ہوا جن کے سردار کو بچھو نے ڈس لیا تھا، ان کی درخواست پر انہوں نے یہ سوچ کر کہ پورا قرآن شفا ہے اور سورہ فاتحہ اس کا خلاصہ ہے، صرف سورہ فاتحہ سات مرتبہ پڑھ کر اس سردار پر دم کردیا اور وہ شخص اسی وقت شفایاب ہوگیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالی اپنے فضل سے ستر ہزار لوگوں کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل فرمائیں گے اور ان میں سرفہرست وہ لوگ ہوں گے جو تعویذ گنڈوں پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہر تکلیف اور بیماری میں بھی اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کی دسیوں قرآنی دعائیں اور نبوی اذکار واوراد جس سے ہر طرح کی آزمائشوں سے اللہ پاک اس کا ورد رکھنے والوں کو محفوظ رکھتے ہیں، ہمارا المیہ یہ ہے کہ جب ہم بیماریوں، مصیبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا ہوتے ہیں تو اس کے ازالہ کے لیے ہر طرح کا علاج کرتے ہیں، لاکھوں روپئے خرچ کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات بے بسی اور مایوسی کے عالم میں غیر شعوری طور پر شرکیہ عمل وعلاج سے بھی دریغ نہیں کرتے، لیکن بیماری اور شفا کے تنہا مالک رب العالمین کی طرف سے بتائی گئی پیش بندی کرنے والی ان مؤثر ومجرب دعاؤں، اذکار واوراد اور پیشگی بتائے گئے اس قرآنی ونبوی مفت علاج کی طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا جس سے صحت وعافیت اور مسائل ومصائب سے حفاظت کے ساتھ ایمان کی بھی سلامتی کی ضمانت ہوتی ہے، کاش اس پر ہم توجہ دیتے اور اپنے روزانہ کے معمولات میں چند منٹ نکال کر ان قرآنی ومسنون دعاؤں کو شامل کرتے تو ہمیں وہ بہت سارے دل دہلانے والے معاشرے میں روز پیش آنے والے شرکیہ واقعات کو سننے سے بھی نجات ملتی۔

☆☆☆

سفرنامہ

تاریخی شہر استنبول میں

ہواخیمہ زن کاروانِ بہار

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

مسلمان علماء اور اسلامی دانشور حضرات کی ایک بین الاقوامی تنظیم الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین ہے، اس تنظیم کا صدر مقام قطر ہے، اس کے صدر علامہ یوسف القرضاوی اور نائب صدر تونس کے اسلامی مفکر راشد الغنوشی ہیں، جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی محی الدین القرہ داغی ہیں، سوڈان کے معروف ادیب وخطیب عصام البشیر اور سعودی عرب کے سلمان عودۃ اہم اور فعال کارکن ہیں، مؤخر الذکر آج کل مصر کے سلسلہ میں سعودی موقف کی مخالفت کی وجہ سے معتوب ہیں، دنیا سے اٹھارہ سو علماء اس تنظیم کے ممبر ہیں اور جو دیگر انجمنیں اور تنظیمیں اس تنظیم میں داخل ہو چکی ہیں اگر ان کے علماء کو بھی شمار کیا جائے تو اس تنظیم سے وابستہ علماء کی تعداد دس ہزار تک پہنچتی ہے۔ اس تنظیم نے راقم السطور کو نہ صرف رکنیت عطا کی، بلکہ استنبول میں علماء کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت بھی دی۔ اس وقت دنیا میں خاص طور پر مصر وعراق وفلسطین اور لیبیا کے سیاسی حالات ناگفتہ بہ ہیں، اس خزاں رسیدہ عرب دنیا کی موجودہ غم انگیز صورت حال میں استنبول کی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو ایسا محسوس ہوا کہ پھول کھل اٹھے ہوں اور ویرانہ میں بہار آگئی ہو اور شام غم میں صبح عید کا یا نور امید کا جلوہ نظر آگیا ہو۔ خوشی اس بات کی تھی کہ ان جید علماء سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع ملے گا جو عالم اسلام پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اہل علم اور مفکرین سے مل کر غنچہ دل شگفتہ ہوتا ہے۔

حضور ﷺ نے اس شہر کے فتح کی خوش خبری دی تھی (لتفتحن القسطنطينية، فلنعم الأمير أميرها، ولنعم الجيش جيشها۔ یعنی تم ضرور بالضرور قسطنطنیہ کو فتح کروگے اور خوشا اس کا امیر اور خوشا اس کا فتح کرنے والا لشکر) اس شہر پر حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں سب سے پہلے حملہ کیا گیا اور حضرت ابوایوب انصاریؓ اس لشکر میں شریک تھے، لیکن اس شہر کو فتح کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے سلطان محمد فاتح کی قسمت میں لکھی تھی، اس

نے اس شہر کو دارالحکومت بنایا اور اب یہ شہر استنبول کے نام سے معروف ہے، عالمی تنظیم الاتحاد العالمی کی کانفرنس اسی شہر استنبول میں منعقد ہو رہی تھی، کانفرنس کا موضوع ''امت کی ترقی اور اس کی سربلندی میں علماء کا کردار'' تھا۔ اس وقت موسم بھی معتدل تھا اور قدرت کا حسن و جمال بھی نقطۂ عروج کو چھو رہا تھا۔ ہندوستان کی معروف شخصیات میں مولانا جلال الدین عمری ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں اور مولانا عنایت اللہ سبحانی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ترکی کے اور عرب ملکوں کے علماء موجود تھے۔ مجھے اقبال کا مصرعہ یاد آرہا تھا ''شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی''۔

عرب دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں سب سے متوازن موقف قطر کا اور ترکی کا ہے، یہ ترکی ہے جس نے سیریا کے پندرہ لاکھ مظلوموں کو پناہ دے رکھی ہے اور تین سال سے ان کی مہمان نوازی کر رہا ہے، اس کانفرنس پر انہیں دونوں حق پسندوں اور منصف مزاج ملکوں کا سایۂ ہمایونی ہے، جو علماء اس میں شریک ہوئے وہ اپنے اپنے ملکوں میں محترم اور ان کی حق گوئی مسلم ہے۔ ترکی کا اور عربوں کی تاریخ کا دھارا پانچ سو سال تک مشترک طور پر بہتا رہا، ۱۵۳۴ء میں سلیمان قانونی نے بغداد فتح کیا تھا اور ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول کیا گیا تھا، اس پورے عرصہ میں ترکوں اور عربوں کی تاریخ ایک قالب میں ڈھلتی رہی ہے، ترکوں کی خلافت کو ختم کرنے میں انگریزوں کی سازش کام کرتی رہی ہے، لارنس آف عربیہ نے عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا، عرب اس سازش کے شکار ہوئے، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ یورپ کی قوموں نے اپنی اپنی حکومتیں عالم عرب کے مختلف خطوں میں قائم کر لیں، استعمار کا جال بچھا دیا۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے نہ صرف اسلامی خلافت ختم کی، بلکہ پورے ملک کو لادینیت کے راستے پر چلانا شروع کیا، عربی رسم الخط کو بدلا، عربی میں اذان کو ممنوع قرار دیا گیا اور سروں پر ہیٹ رکھ دیا گیا، لیکن ترکوں کے اندر دین سے محبت کا تخم موجود تھا، ۲۰۰۲ء میں پھر اس ملک میں انقلاب آیا اور اب یہ ملک نجم الدین اربکان اور ان کے بعد عبداللہ گل اور رجب طیب اردغان کی حکیمانہ کوششوں سے اسلامیت کی جانب گامزن ہے، لیکن جس طرح دنیائے اسلام نے ترکی سے بہت سی توقعات وابستہ کی ہیں اسی طرح سے یہ ملک یورپ اور امریکہ کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ عیسائی دنیا اس بات کو فراموش نہیں کر سکتی ہے کہ رومن امپائر اور بازنطینی سلطنت کا مشرقی پایہ تخت قسطنطنیہ عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل کر مسلمانوں کے قبضہ میں چلا گیا، عیسائی دنیا کے لئے یہ تکلیف ناقابل برداشت ہے کہ ترکی میں اسلامی ذہن وفکر کی حکومت ہو، چنانچہ ترکی یورپ کے نشانہ پر ہے اور وہاں بھی اس بات کی کوشش ہے کہ کوئی عبدالفتاح سیسی کی طرح کا آدمی کھڑا ہو جائے جو یورپ کا

پٹھو ہو اور مصطفیٰ کمال اتاترک کی طرح اسلام دشمن ہو۔ اللہ تعالیٰ ترکی کو بچائے اس بات سے کہ اس کا حال مصر کی طرح ہو جائے جہاں سازش کے تحت اخوان المسلمین کی حکومت کو گرا دیا گیا اور ایک اسلام دشمن اسرائیل نواز شخص کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور حوالہ کر دی گئی۔ مصر کی طرح تیونس میں بھی سازش کی گئی تھی لیکن راشد الغنوشی کی حکمت عملی نے ملک کو بچا لیا۔ لیکن مصر کے بارے میں سازش بہت گہری تھی یہاں اسرائیل کے مستقبل کا سوال تھا۔ عالمی طاقتوں کے ساتھ حق فروش اور دین فراموش خلیجی ریاستیں اس میں شریک ہو گئی تھیں۔ ان ریاستوں کی شرکت پورے عالم اسلام کے لئے دل کا داغ اور سینہ کا چراغ ہے اور اب ان ریاستوں کے بے ضمیر سفارت کار ان اسلامی شخصیات کے در پے آزار بن چکے ہیں جو ان اخوان المسلمین سے ہمدردی رکھتے ہیں جن کو دار و رسن کے فیصلے سنائے گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ امت کی سر بلندی میں ہمارے بہت سے علماء کا کردار بہت خراب ہے کہ انہوں نے لب اظہار پر تالے ڈال لئے اور ان ملکوں کے سفارت کاروں کی رشوتیں قبول کر لیں جنہوں نے ظالموں کا ساتھ اور اخوان کو دہشت گرد قرار دیا۔ حالانکہ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ حکم ہے کہ ظالم کی طرف تمہارا ادنیٰ میلان نہیں ہونا چاہیے (لا ترکنوا الی الذین ظلموا)۔

ابھی تک رجب طیب اردغان کا اقتدار مضبوط اور ناقابل شکست ہے، عام انتخابات میں صدارت کے عہدہ کے لئے ان کی کامیابی نے انہیں مضبوط تر اور پائندہ تر کر دیا ہے، دنیا کے مسلمانوں کی یہ ایک ہر دل عزیز حکومت ہے، یہ وہ حکومت ہے جس نے بشار الاسد کی حکومت کی سخت مخالفت کی اور شام کے مظلوموں کو پناہ دی، جس نے مصر میں اخوان کا ساتھ دیا اور عبد الفتاح السیسی کے انقلاب کی سخت مذمت کی، دین سے محبت اور اسلامی غیرت ترکوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اور پوری قوم اسلام کی فدائی اور شیدائی ہے، لیکن اس اسلام پسند حکومت کو سازش اور شرارتوں کا سامنا ہے، ابھی تازہ رکاوٹ جو سامنے آئی ہے، یہ فتح اللہ گولن نے کھڑی کی ہے، لیکن رجب طیب اردغان نے اقتصادی اعتبار سے ملک کو اس قدر خوش حال اور مضبوط کر دیا ہے کہ ترکی کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے لگا ہے اور ترکی کے عوام و خواص سب حکومت کے ثنا خواں اور قدر داں بن گئے ہیں اور اس لیے وہ فتح اللہ گولن کے اخبارات اور ٹیلیویژن کے مخالفانہ پروپیگنڈہ سے گمراہ نہیں ہوئے۔

اس کانفرنس میں لوگوں سے مل کر فتح اللہ گولن کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ ترکی اور ایران کی سرحد کے قریب ان کی پیدائش ہوئی تھی، تعلیم ازمیر میں حاصل کی، یہ ترکی کے مشرقی حصہ میں یونانا کے

قریب واقع ہے، تعلیم کے دوران دماغی عارضہ کی وجہ سے پاگل خانہ میں داخل ہونا پڑا تھا، دوسال تک علاج ہوا، پھر صحت حاصل ہوئی، پھر دینی تعلیم حاصل کی اور واعظ بن گئے وعظ میں ان پر رقت طاری ہوتی تھی اور وہ دوسروں کو بھی رلاتے تھے، ترک قوم ان سے متاثر ہوئی اور ان کی شہرت موج نسیم اور باد شمیم کی طرح دور دور تک پھیلتی چلی گئی، پھر انہوں نے عصری تعلیم کو اپنی کوششوں کا محور بنایا، استنبول میں انہوں نے فاتح یونیورسٹی قائم کی، اہل دولت و ثروت نے ان کے ساتھ پورا تعاون کیا، پھر ان کے تعلقات امریکہ کے یہودیوں سے اور خفیہ تنظیموں سے بھی ہوگئے، معلوم ہوا کہ وہ ایک سو بلین ڈالر جمع کرنے میں کامیاب ہوگئے، فتح اللہ گولن کی شخصیت بہت سے لوگوں کے نزدیک مشتبہ رہی ہے، انہوں نے آج تک نہ اسرائیل کی مذمت کی اور نہ فلسطینیوں سے ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار کیا۔ مصر میں عبدالفتاح السیسی کے ہاتھوں اخوان کا قتل عام ہوا تھا، انہوں نے اس قتل کو بھی جائز ٹھہرایا، وہ حماس کی بھی مذمت کرتے ہیں اور اس پر جارحیت کا الزام لگاتے ہیں، ترکی میں جتنی اسلام دشمن جماعتیں ہیں ان سب سے فتح اللہ کے خفیہ تعلقات ہیں۔ اس مشتبہ کردار کی وجہ سے جب وہ تنقید اور انگشت نمائی کا ہدف بنے تو ترکی کو خیر باد کہہ کر امریکہ چلے گئے اور اسی کو اپنا مستقل مسکن اور نشیمن بنایا اور پھر کبھی انہوں نے ترکی کا رخ نہیں کیا، بعد میں ایک اور چیز سامنے آئی اور وہ یہ کہ سیکیوریٹی میں اپنے خاص آدمیوں کے ذریعہ انہوں نے اہم شخصیتوں کے فون ٹیپ کرنے کی کوشش کی، ایسا محسوس ہوا کہ وہ اسلام دشمن طاقتوں کے آلہ کار بن گئے ہیں، ان کی شبیہ اتنی خراب ہوگئی کہ خود ان کی جماعت کے بہت سے لوگوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور یہ سب امریکہ سے ترکی واپس آ گئے۔ فتح اللہ گولن کی شہرت ان کے قائم کردہ بے شمار اسکولوں کے ذریعہ ہوئی جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن کسی اسکول میں دینی تعلیم نہیں دی جاتی ہے، ترکی زبان تک نہیں سکھائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے معتقدین کے حلقوں میں عجیب وغریب قسم کے دعوے بھی کئے ہیں، جیسے یہ دعویٰ کہ ایک بار انہوں نے آسمان پر تمام اولیاء اللہ کی نماز کی امامت کی ہے، اب ان کی مقبولیت اس قدر کم ہوگئی ہے کہ ان کا قائم کردہ ایشین بینک جس کی شاخیں ہر شہر اور ہر شاہراہ پر موجود تھیں بند ہونے کے قریب پہنچ گیا ہے۔ امریکہ سے فتح اللہ گولن کے روابط کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ جب ترکی کا پانی کا جہاز فلسطینیوں کی امداد اور غذائی سامان لے کر جارہا تھا اور اسرائیل نے اس پر حملہ کر دیا تھا جس سے کئی ترکی جاں بحق ہوگئے تھے تو ترکی نے یہ مقدمہ بین الاقوامی عدالت میں لے جانے کا فیصلہ کیا تھا، عدالت میں اسرائیل کو جارحیت کا مرتکب قرار دیا جاتا، اسرائیل نے سبکی سے بچنے کے لئے امریکی صدر کا سہارا لیا اور امریکی

صدر نے فتح اللہ گولن کا۔ گولن نے کبھی بھی اسرائیل کی مذمت نہیں کی اور مذمت کی تو حماس کی کی۔ یہ ہیں وہ معلومات جو فتح اللہ گولن کے سلسلہ میں ترکی میں حاصل ہوئی ہیں۔

علماء کی تنظیم الاتحاد العالمی کی کانفرنس ۲۰/اگست ۲۰۱۴ء سے استنبول میں منعقد ہوئی اور ایسے وقت میں منعقد ہوئی جب غزہ لہولہان تھا اور ملک شام کی شام، شام غریباں بنی ہوئی تھی، مصر میں دوبارہ فرعون کی واپسی ہوچکی تھی اور عراق میں نوری المالکی کی خونریزی اور اہل سنت پر ستم رانی کے ردعمل میں داعش کی تنظیم فاتحانہ آگے بڑھ رہی تھی، اس فضا میں ساری دنیا کے مسلمان عالم دین و دانشور استنبول شہر میں جمع تھے، پورا شہر خوبصورتی میں بے مثال اور حسن و جمال سے مالا مال ہے، سرو وصنوبر اور چنار کے سر بفلک درخت بہت کثرت سے نظر آتے ہیں، سلیقہ مندی، سجاوٹ اور صفائی ستھرائی میں اور چمن بندی و شجر کاری میں پورا شہر اور خاص طور پر اس کا ایشیائی حصہ ایک نمونہ ہے، ایشیائی حصہ زیادہ خوبصورت اس لیے ہے کہ اصل اور قدیم شہر یورپ کے حصہ میں واقع ہے، جب توسیع کی ضرورت پیش آئی تو ایشیائی حصہ میں ایک پلاننگ کے تحت شہر بسایا گیا، ہر عمارت کے سامنے ایک باغیچہ ہے جس میں مختلف رنگ کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں، عمارتیں اپنی مضبوطی اور استحکام میں بے نظیر ہیں۔ ترکی کی مسجدیں شوکت اور دبدبہ اور جلال کے اعتبار سے دنیا میں بے مثال ہیں۔ ہر مسجد میں وہاں ایک گوشہ خانم بھی ہے یعنی عورتوں کے نماز پڑھنے کی جگہ۔ ہندوستانی مسجدوں میں عورتوں کے لئے یہ سہولت نہیں ہوتی ہے۔ یہ تسلیم کہ عورتوں کی نماز گھر میں افضل ہے لیکن وہ عورتیں جو شاپنگ کے لئے جائیں گی جس کی دین میں پوری اجازت ہے تو آخر وہ نماز کہاں پڑھیں گی۔ کیا یہ بات لائق توجہ نہیں ہے؟

ترک قوم فعال اور محنت کش قوم ہے، دین سے محبت و غیرت ترکوں کے ضمیر وخمیر میں داخل ہے، ان کے چہرے بھی اس عشق کی غمازی کرتے ہیں، ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی کا یہ کردار یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان کو یہودیوں کی طرف سے دولت کا ذخیرہ پیش کیا گیا اور اس کے عوض یہ مطالبہ تھا کہ فلسطین کے اندر یہودیوں کو آباد کرنے کی اجازت دی جائے، مگر سلطان نے یہ کہہ کر اس دولت کو ٹھکرادیا کہ بیت المقدس کی سرزمین کی مٹی کی ایک مٹھی سیم و زر کے انبار سے بہتر ہے، انہوں نے کہا کہ فلسطین کو ہمارے آباء واجداد نے خون سے خریدا تھا اور ہم سے بھی خون کے عوض ہی خریدا جا سکتا ہے۔ پھر سلطان نے یہودی قاصد کے اس مطالبہ پر کہ یافہ اور غزہ کے پاس کی اراضی جمعیت صہیون کے حوالہ کردی جائے، یہ جواب دیا تھا کہ میرے لئے آسان ہے کہ میرے جسم کی تکہ بوٹی کردی جائے، مگر میرے لئے آسان کہ نہیں فلسطین کو میری

زمین سے کاٹا جائے۔اس کردار کا موازنہ عرب حکمرانوں کے کردار سے کیا جاسکتا ہے جنہوں نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالہ کر دیا اور کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے تحت بیت المقدس اور فلسطین پر اسرائیل کا حق تسلیم کر لیا، آج خلیجی ریاستیں ببانگ دہل حماس کو دہشت گرد تنظیم قرار دیتی ہیں۔

الاتحاد العالمی عالم اسلام کے مسلم دانشوروں اور علماء کی سب سے بڑی تنظیم ہے، مجھے بہت سے مندوبین سے جن میں اکثر عرب تھے، عرب دنیا کے حالات پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا، ہم نے جن اراکین اور مندوبین سے ملاقات کی ان میں ایک بھی نہیں تھا جو مصر، عبدالفتاح سیسی، اخوان کے سلسلہ میں سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے موقف کا حامی اور مؤید ہو، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عالم اسلام کے اجتماعی ضمیر نے خلیجی ریاستوں کے موقف کو یکلخت مسترد کر دیا، ہندوستان میں جن لوگوں نے خلیجی ریاستوں کے موقف پر تنقید کی انہوں نے منکر پر نکیر کا فرض کفایہ انجام دیا، اگر دین وشریعت کے لحاظ سے اس غلط موقف پر تنقید نہ کی جاتی تو پوری امت گنہگار ہوتی، جو علماء اور دانشور اپنی اپنی مالی اور مادی مصلحتوں کی وجہ سے تنقید نہ کر سکے ان کو تنقید کرنے والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ ان کی وجہ سے گناہ سے بچ گئے، مکہ اور مدینہ کی تولیت جن کے ہاتھوں میں ہے ان پر تنقید اور مخالفت کسی کے لئے بھی خوشی کی بات نہیں ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حق بہر حال سب سے بلند اور عزیز تر ہے۔

سیریا کے سلسلہ میں کانفرنس میں شریک ہونے والے اراکین اور مندوبین سے گفتگو ہوئی تو لوگوں نے یہ بتایا کہ اگر چہ روس اور چین نے بشار الاسد کی مدد کی، لیکن اگر ایران نے فوج اور اسلحہ کے ساتھ حزب اللہ کے ساتھ مدد نہ کی ہوتی تو اب سے بہت پہلے بشار الاسد نے راہ فرار اختیار کر لی ہوتی، سیریا میں دو لاکھ انسانوں کا قتل عام ہوا اور سب سے بڑا مجرم ملک ایران ہے، بعض مندوبین نے یہ بھی کہا کہ بشار الاسد کے اقتدار پر جمے رہنے کی دوسری وجہ دنیا کی دوسری طاقتوں کا خاموشی سے اور خفیہ طریقہ سے وہاں کی حکومت کا ساتھ دینا ہے، کیوں کہ شام کی موجودہ حکومت اگر گر جائے گی تو جو لوگ وہاں کے اقتدار پر قابض ہوں گے وہ اسلام پسند ہوں گے اور ایک نہ ایک دن اسرائیل کے خلاف بھی کارروائی کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ خون مسلم سے جہاد کے شوق کو مٹایا نہیں جاسکتا ہے۔

عراق سے بھی بہت سارے مندوبین آئے تھے، داعش کے سلسلہ میں کنفیوژن تھا، چنانچہ اس کنفیوژن کو دور کرنے کے لئے عراق سے آنے والے اراکین سے ہم نے گفتگو کی ہم نے ان اراکین کو مختلف الخیال پایا۔ایک معزز رکن جونوری المالکی کی حکومت کے اہل سنت پر مظالم کے چشم دید گواہ تھے اور داعش کے بہت موید اور حامی تھے، یہ کہنے لگے کہ داعش کے ظلم واستبداد کا بہت شور وغوغا ہے

اور پچھلے تین سال سے ہر ہفتہ پندرہ سولہ سنی حضرات کو پھانسیاں دی جارہی تھیں اس پر لوگوں نے واویلا کیوں نہیں مچایا، پورے عراق سے فوج اور تمام اہم منصب سے ایک ایک کر کے اہل سنت والجماعت کو ہٹایا گیا، آج اگر داعش کے لوگ کھڑے نہیں ہوتے تو مظالم کا یہ سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ایک دوسرے معزز عراقی رکن سے بعد میں جب اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں کردی ہوں اور کردستان کی آزادی کا حامی ہوں، ہمیں یہ گوارا نہیں کہ داعش کا کردستان پر قبضہ ہو اور تیل سے مالا مال یہ علاقہ ان کے قبضہ میں چلا جائے۔ ایک اور معروف عالم دین جو شام کے رہنے والے ہیں اور رابطہ ادب اسلامی کے ممبر بھی ہیں اور جن کا نام خالد الہنداوی ہے، انہوں نے کہا کہ میں شام اکثر جاتا رہتا ہوں اور مجاہدین سے میری ملاقات بھی ہوتی ہے، داعش کے اندر وہ خصلتیں ہیں جو تاریخ اسلام کے شروع میں خوارج کے اندر پائی جاتی تھیں، خوارج گناہ کا ارتکاب کرنے والے کو کافر کہتے تھے، داعش والے بھی تارکِ نماز کو بہت آسانی سے گولی مار دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر مختلف خیالات کو سننے کے بعد یہ بات ذہن میں آئی کہ داعش والوں میں تشدد اور انتہا پسندی نہ ہوتی، میانہ روی ہوتی اور وہ لوگوں کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ کرتے تو ان کے ساتھ ہمدردی ہوتی اور پھر ذوق جہاد اور شوق شہادت کی وجہ سے وہ بغداد اور دمشق پر قبضہ کر سکتے تھے اور مستقبل میں اسرائیل سے نپٹنے والے بھی یہی مجاہد قسم کے لوگ ہوتے، کاش یہ لوگ اپنی اصلاح کر لیں اور غلطیوں سے باز آجائیں۔ الاتحاد العالمی کی عالمی تنظیم نے داعش کے دعوی خلافت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے داعش کے سلسلہ میں جتنے منہ اتنی باتیں، کوئی کہتا ہے ان کو بشار الاسد نے کھڑا کیا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ امریکہ نے اور کوئی کہتا ہے سعودی عرب نے۔ شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔

☆☆☆

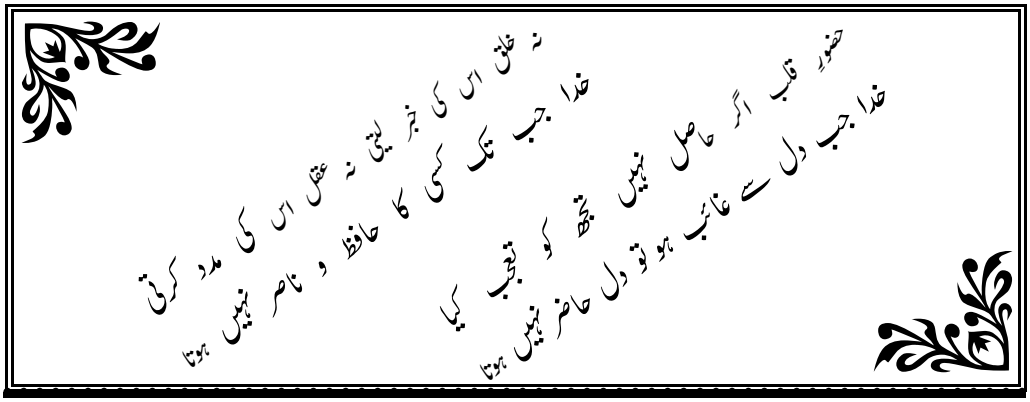

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : شیخ مبارک بودلے جائسیؒ اور۔۔۔۔۔

\Nov_14\sheikh_muba not found.

مصنف: محسن عتیق خان ندوی

صفحات: ۵۴

ناشر: برائٹ وے فاؤنڈیشن لکھنؤ

ملنے کے پتے: مکتبۃ الایمان شاہین باغ دہلی، مکتبہ ندویہ لکھنؤ

بقلم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

بحث وتحقیق کا عمل قومی وعلمی زندگی کی علامت ہے، اس میں شک نہیں کہ مشینی ترقی اور انٹرنیٹ کی رفتار نے کتب بینی اور علمی وتحقیقی عمل کو بے حد متاثر کیا ہے، لیکن پھر بھی یہ بات خوش آئند ہے کہ ہمارے یہاں ایسے صالح نوجوان خال خال ہی صحیح مگر پائے جاتے ہیں جن کو علم وتحقیق سے شغف ہے اور ان کی ابتدائی کاوشیں ان میں تلاش وجستجو کا جذبہ ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔

زیر نظر رسالہ درحقیقت ایک علمی وتحقیقی مقالہ تھا جو مشہور زمانہ علمی مجلّہ ''معارف'' میں راقم کی نظر سے بھی گزرا تھا پھر اس پر تعقیب وتعاقب کا بھی سلسلہ رہا جو شاید بے جا و بے محل تھا، نوجوان صاحب قلم جناب محسن عتیق خاں نے اس کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کو ایک رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مختصر رسالہ ہزاروں صفحات کے مطالعہ اور بڑی عرق ریزی کے بعد قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا ہے، مصنف نے چونکہ سب سے پہلے اپنے خاندان کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی اور The Khans of Satanpurwa A Historical and socio-cultural Account کی ترتیب میں انہیں شیخ مبارک بودلے کا تذکرہ ملا جو کہ ذریعہ بنے تھے راجہ ڈینگر کے قبول اسلام کا، راجہ ڈینگر سے مصنف کا خونی رشتہ ہے، اسی عقیدت ومحبت نے انہیں شیخ مبارک مبادلے کا تذکرہ لکھنے پر مجبور کیا اور تحقیق بسیار کے بعد وہ یہ قیمتی کتابچہ منظر عام پر

لے آئے، مصنف نے خود تعجب کا اظہار کیا ہے کہ جس شخصیت کے توسط سے متعدد راجگان اودھ نے اسلام قبول کیا اور بندگان خدا نے ہدایت پائی اس کا تذکرہ ملنا اس قدر دشوار ہے کہ بڑی بڑی تذکرہ کی کتابیں بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں، بہر حال انہوں نے بڑی عرق ریزی سے معلومات جمع کیں اور انہیں مرتب کر کے ہمارے کتب خانہ میں ایک بیش قیمت اضافہ کیا۔

رسالہ میں تحقیقی عمل اپنی مثال آپ ہے، زبان شستہ اور علمی ہے، سب سے زیادہ جو چیز دل کو بھائی وہ یہ کہ موصوف کی اس کاوش میں ندویت کی جھلک صاف نظر آئی، موصوف نے شیخ بودلے کے حالات زندگی کے ساتھ ان کے خلفاء اور ارادت مندگان پر بھی مختصر روشنی ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے، موضوع کے دوسرے پہلو ''اودھ میں اسلام کی نشر و اشاعت میں ان کی خدمات'' پر انہوں نے حتی المقدور خاص معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، جسے پڑھ کر واقعی تعجب ہوا کہ صوفیاء کی فہرست اور تذکروں میں ان کا ذکر تو خوب ہونا چاہیے تھا جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، اس رسالہ کی جس خوبی نے مصنف کا قد بلند کیا وہ ان کے مقالہ کا آخری پیراگراف ہے جس نے یہ صادکرایا کہ محض محقق ہونا خاص بات نہیں، بلکہ صحیح الفکر محقق ہونا اور ہر آن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرضِ منصبی کو پیش نظر رکھنا اہم بات ہے، وہ لکھتے ہیں ''شیخ مبارک بودلےؒ کے انتقال کے بعد آنے والی نسل اخلاق و اعمال کے زوال سے دوچار ہوئی۔ ایک طرف ان کے عقائد نے ہندوستانی رنگ اختیار کیا، تو دوسری طرف ہندوستانی روایات نے اسلامی اقدار کی جگہ لینی شروع کر دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تعلیم و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت میں مشغول ہونے کے بجائے عرس و فاتحہ اور محرم و عزاداری کے مراسم میں الجھ کر رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اولاد کو صراط مستقیم پر چلنے اور آپ ہی کی طرح اسلام کی نشر و اشاعت میں خاطر خواہ حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائے۔''

یہ کاوش واقعی قابل قدر اور لائق تحسین ہے، بعض جگہ الفاظ کے استعمال پر نظر ٹھہر گئی لیکن خیال ہوا کہ مصنف ممکن ہے آئندہ اور تنقیح کریں گے جس سے پھر یہ الفاظ بھی صحیح ہو جائیں گے، یہ امر خوش کن ہے کہ پورا رسالہ پروف کی غلطیوں سے تقریباً پاک ہے، طباعت یقیناً غیر معیاری ہے لیکن اردو کی کتابوں کی جس طرح نا قدری ہوتی ہے اور لوگ جس طرح محض ہدایا و تحائف میں کتابیں آنے کے متمنی رہتے ہیں تو اس صورت حال میں طباعت کا معیاری ہونا یقیناً مشکل ہے۔

☆☆☆

Nov_14\Mufakkir_i
not found.

نام کتاب: مفکر اسلام-ایک مطالعہ
مصنف: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
ناشر: مرکز ثقافت وتحقیق، علی گڑھ

بقلم: شاکر فرخ ندوی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ بیسویں صدی کے عظیم مجدد، صحیح اسلامی فکر رکھنے والے اور اقبال کے مرد مؤمن تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے پورے عالم اسلام میں یکساں مقبولیت سے نوازا تھا، عرب وعجم آپ کی مدح سرائی کرتے ہوئے اور آپ کے عظیم علمی وفکری کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، آپ کی زندگی پر عربی واردو وغیرہ کی بے شمار تحریریں منظر عام پر آچکی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مصنف محترم ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے سوانح نگاری کے مروجہ طرز سے ہٹ کر حضرت مولانا کی زندگی کے فکری پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو مفکر اسلام کا جو لقب دیا گیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہی لقب اس شخصیت کے لئے موزوں تھا، کتاب کے مصنف نے حضرت مولانا کے متعلق تحریروں سے زیادہ خود حضرت مولانا کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کرکے آپ کے افکار ونظریات کو واضح کیا ہے، اور عالمی پس منظر میں بحیثیت صاحب فراست مؤمن اور مخلص داعی کے جو تقاضے اور ذمہ داریاں ہیں، اور مادیت کے اس سیل رواں میں مؤمن کا کیا کردار ہونا چاہیے، مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی نظام تعلیم کی خرابیاں، عالم عربی کے حالات، اسلامی سیاست وصحافت کی اہمیت، آنے والے خطرات کا صحیح وقت پر ادراک، ملت اسلامیہ کے تشخص کا مسئلہ، نسل نو کے دین وایمان کی حفاظت کیسے ممکن ہے؟ وغیرہ۔ یہ سب ایسے سوالات ہیں کہ مولانا علی میاںؒ نے مختلف مواقع پر جن کے جوابات دیئے ہیں اور جن کو حل کرنے کے لئے ہر ممکن جدوجہد کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں مصنف محترم نے مولانا علی میاںؒ کو تمام زاویوں سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب پر پروفیسر محسن عثمانی کا فکری وادبی مقدمہ ہے، جس نے کتاب کی اہمیت وافادیت میں گرانقدر اضافہ کردیا ہے، مصنف اور کتاب کے متعلق پروفیسر محسن عثمانی صاحب کی رائے نہایت اہم ہے، جس کے بعد شاید کسی تبصرہ یا تعارف کی ضرورت نہیں رہ جاتی، فرماتے ہیں:

''مصنف کتاب ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی کے یہاں مولانا علی میاں کی شخصیت کو پیش کرنے کے لئے شخصیت شناسی کا جوہر موجود ہے، اس لئے ان کی مذکورہ کتاب مولاناؒ کی شخصیت پر ایک کلیدی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، امید ہے اہل ذوق کے درمیان نگاہِ شوق سے پڑھی جائے گی، اور اس سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہوگا۔

اللہ تعالیٰ مصنف محترم کو اجر جزیل عطا فرمائے، اور ہم سب کو حضرت مولانا کے علمی ذخیرہ سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

آخری صفحہ

قبول کرلیں تو سمجھیں کہ ہم بھی مخلص ہیں

علامہ شعرانیؒ دسویں صدی ہجری کے ایک بڑے متبحر عالم و عارف گزرے ہیں ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''تنبیہ المغترین'' ہے جس کا ترجمہ ماضی قریب کے ایک ولی کامل عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپگڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے جس کا نام ''اخلاقِ سلف'' ہے۔

انہوں نے (علامہ شعرانیؒ نے) بڑے عجیب انداز میں اخلاص کی علامت اور نشانی بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں ''کہ جو کام تم کررہے ہو اگر کوئی دوسرا اس کام کا کرنے والا تم سے اچھا اس بستی میں آجائے اور وہ کام ایسا ہو جو علی العین واجب نہ ہو جیسے مسجد و مدرسہ کا اہتمام یا وعظ کہنا، پیری مریدی کرنا، یا کسی نیک کام کے لیے چندہ کرنا وغیرہ تو تم کو اس کے آنے کی خوشی ہو رنج نہ ہو، بلکہ تم خود لوگوں کو اس کے پاس بھیجو کہ وہاں جاؤ، وہ مجھ سے بہتر ہیں خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایسے آدمی کو بھیج دیا جس نے تمہارا بوجھ ہلکا کردیا۔ اگر یہ حالت ہو تب تو تم واقعی مخلص ہو۔ مگر اب تو اگر کسی عالم کی بستی میں کوئی دوسرا چلا جائے جس کی طرف عوام کا رجوع ہونے لگے تو جلتے مرتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ اس شخص سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوجائے جس سے عوام بدگمان ہوجائیں اور اس کو چھوڑ دیں، سمجھتے ہیں کہ بس تمام لوگوں کو ہماری طرف رجوع کرنا چاہیے، کسی اور کی طرف رخ بھی نہ کرنا چاہیے، اس حالت میں تم ہرگز مخلص نہیں ہو بلکہ اخلاص سے مفلس ہو۔'' (اصلاح العلماء والطلباء)

علامہ شعرانیؒ نے یہ بات آج سے کئی صدی پہلے فرمائی تھی اور اخلاص کا صحیح مفہوم اور معنی خیز تعریف فرمائی تھی، زمانے کے تفاوت اور بعد پر نظر ڈالئے محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ بات آج کے زمانے اور حالات کے تناظر اور پسِ منظر میں کہی جارہی ہے۔

عوام الناس کو تو جانے دیجئے، کیا خواص اور علماء کے اندر بھی اخلاص کا یہ معیار ہے؟ ہم جیسے عام علماء جنہوں نے صرف رسمی تعلیم حاصل کرلی ہے چند کتابوں کو پڑھ کر اپنا نام عالم رکھ لیا ہے ہمارے اندر اخلاص کس قدر ہوگا یہ تو ظاہر و باہر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں ہر شخص شہرت و ناموری کے بام عروج پر پہنچ جانے کا خواہاں ہے، اخلاص وللّٰہیت کا دور دور تک نام ونشان نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ کام تو بہت ہورہے ہیں لیکن نتائج صفر میں ہیں اس کی بنیادی وجہ خلوص وللّٰہیت کی کمی بلکہ فقدان ہے جگر مرادآبادی نے سچ کہا ہے ؎

واعظ کا ہر ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اور اسی مفہوم کو علامہ اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے ؎

صفیں کج دل پریشان سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کی دولت سے مالا مال کرے نام ونمود شہرت و ناموری عہدہ ومنصب کی طلب وخواہش اور حرص وطمع سے محفوظ رکھے اور اخلاصِ نیت کے ساتھ کام کرنے کی توفیق دے کیوں کہ یہی عمل کی روح اور اس کی جان ہے۔

قبول کر لیں تو سمجھیں کہ ہم بھی مخلص ہیں
کئے ہیں پیش دل وجاں کے ہم نے نذرانے

☆☆☆ (م۔ق۔ن)